سنت ابراہیم

حج وقربانی

خطبہ ماثورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ ۔

اما بعد! ففی حدیثہ صلی اللہ علیہ وسلم قالوا ما ھذہ الاضاحی یا رسول اللہ قال سنۃ ابیکم ابراھیم. (السنن الکبری للبیھقی)

ترجمہ:۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ قربانیاں کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہارے ابا جان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہیں۔

عیدگاہ کی حاضری کا اہتمام

چونکہ زمانہ قربانی کا قریب ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ قربانی کے مسائل ضرور بیان کئے جائیں کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آج کل قربانی بوجہ لاپروائی کے حسب قاعدہ نہیں کی جاتی حالانکہ ان قواعد کا لحاظ و اہتمام نہایت ضروری ہے اور بعض اہل ثروت کو دیکھا گیا ہے کہ وہ خود قربانی ہی کی طرف توجہ نہیں کرتے حالانکہ ذی وسعت پر قربانی واجب اور اسکے ترک پر وعید وارد ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص وسعت رکھتا ہو اور قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آوے۔ یہ عیدگاہ وہ جگہ ہے جس میں حاضر ہونے کی تاکید اور ترغیب بیان فرمائی ہے کہ جن پر نماز عید واجب بھی نہیں بلکہ ان کو نماز پڑھنا فرض بھی نہیں ان کو بھی پہلے یہ حکم تھا کہ عیدگاہ میں حاضر ہوں چنانچہ حیض والی عورتوں کو حضورؐ نے حکم فرمایا تھا کہ وہ بھی عیدگاہ میں حاضر ہوں۔ حالانکہ حائضہ کو نماز پڑھنا جائز نہیں (مگر یہ حکم حضورؐ ہی کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا اس زمانہ میں بسبب فتنہ کے یہ حکم نہیں جیسا اپنے محل میں تحقیق ہو چکا ہے)

یہاں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو عیدگاہ میں ضرور جانا چاہئے اور وہیں نماز ادا کرنا چاہئے بعض لوگ اس میں تساہل کرتے ہیں اور بلا عذر اپنے محلہ کی مسجد میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ ہمارے فقہاء نے اس کو منع فرمایا ہے البتہ معذورین جو عیدگاہ جانے کی طاقت نہیں رکھتے ان کو اتنی اجازت دی ہے کہ ان کے واسطے بستی میں ایک امام رہ جائے یا ایسا ہی کوئی عذر شرعی ہے ان کو بھی شہر کی مسجد میں پڑھنے کی اجازت ہے اور فقہاء یہ اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ قواعد سے جن کو وہ اپنی خداداد قوت اجتہاد سے سمجھتے کہتے ہیں اور حضورؐ کا فرمودہ باری تعالیٰ کا فرمودہ ہے مولانا فرماتے ہیں۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا اصل میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے اگرچہ وہ کلام اللہ تعالیٰ کے بندہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکل رہا ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بانی اسلام ہیں یہ محض غلط اور باطل ہے بلکہ بانی اسلام باری تعالیٰ ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ (اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دیجئے۔) اس میں صاف تصریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محض مبلغ ہیں اور احکام دینی خدا کے نازل کردہ ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام دین محمدی ہے یعنی یہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کے موجد اور بنانے والے ہیں بلکہ یہ تعبیر مجازی ہے کیونکہ دین تو اللہ ہی کا ہے مگر چونکہ ہم کو بذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے معلوم ہوا ہے اس نسبت خاصہ کی وجہ سے اس طرح تعبیر کر دیا جاتا ہے۔ غرض اصل احکام خدا اور رسول کے ہیں فقہاء کا صرف یہ کام ہے کہ انہوں نے اس قانون خداوندی کو جو بذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بندوں کو پہنچا تھا۔ لوگوں پر ظاہر کر دیا ہے اور بذریعہ قیاس ایسے لوگوں کے لئے اچھی طرح توضیح و تفصیل کر دی جو اس قانون کے سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے تھے۔

اسی واسطے اصول و فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ القياس مظهر لا مثبت (قیاس سے کوئی بات ظاہر ہوتی ہے ثابت نہیں ہوتی) اس کی ایسی مثال ہے جیسا کہ ججان ہائی کورٹ نے ایک مسئلہ کو طے کر دیا ہو کہ وہ دراصل قانون ہی کا فیصلہ ہے جو ضرور ماना جائے گا کیونکہ ججان مذکور واضعان قانون کی مقصود کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ان کا فیصلہ قانونی طور پر صحیح سمجھا جائے گا لیکن یہ نہیں کہا جائے گا کہ ججان مذکور موجد قانون ہیں اور انہوں نے اپنے ایجاد کردہ قانون کے موافق یہ فیصلہ کیا ہے بلکہ وہ مظہر قانون کہلائیں گے۔

یہی مثال فقہاء کی ہے کہ وہ بھی مظہر قانون ہیں نہ کہ موجد، غرض اصل حکم یہ ہے کہ عیدگاہ میں جانا چاہئے۔

رہی یہ بات کہ اس اجتماع و دیگر اجتماعات کی مثل جماعت جمعہ و جماعت پنجگانہ وغیرہ کی کیا مصلحت ہے سو اس مصلحت کے بیان کرنے میں اور نیز دیگر امور شرعیہ کی مصالح کے بیان کرنے میں بھی اس وقت کے عقلاء اور بعض علماء نے بھی ایک غلطی کی ہے اور ٹھوکر کھائی ہے اور حقیقت میں جو چیز اصل مصلحت خداوندی ہے وہ اور ہی شئے ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ جماعت میں مقصود اتفاق ہے اور یہ نکتہ بیان کیا جاتا ہے کہ جماعت پنجگانہ اس مصلحت سے وضع ہوئی تا کہ اہل محلہ شب و روز میں پانچ مرتبہ اپنی اپنی مسجد میں مجتمع و متفق ہو جاویں اور ملاقات کریں اور جمعہ کی جماعت اس مصلحت سے مقرر ہوئی ہے تا کہ تمام شہر کے مسلمان ایک مسجد میں جمع ہو جائیں اور باہم ملاقات کریں اور عید کی جماعت اس غرض سے مقرر کی گئی تا کہ تمام شہر اور اطراف شہر کے کل مسلمان ایک جگہ یعنی عیدگاہ میں جمع ہوں اور باہم ملیں جو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کی اچھی صورت ہے۔

اے حضرات! محققین کے نزدیک یہ نکتے کچھ بھی قدر نہیں رکھتے اور حقیقت میں یہ نکتے کوئی چیز نہیں شریعت نے نکات کا اہتمام نہیں کیا۔ دیکھو شعراء وغیرہ کی کتابیں قافیہ وغیرہ سے پر ہیں اور قرآن مجید میں اس کا کچھ اہتمام نہیں کیا گیا حالانکہ تمام دنیا بھر کی کتابوں سے قرآن پاک افصح و ابلغ ہے۔ اگر نکتے قابل قدر ہوتے تو خدا تعالیٰ قادر تھا کہ تمام قرآن کو مسجع و مقفی کر دیتا مگر باوجود اس کامل قدرت کے پھر ایسا نہ کیا۔ دیکھو سورہ ق مکی ہے اور مکی سورتوں میں بہ نسبت مدنی سورتوں کے بوجہ اس کے کہ مکہ میں اہل زبان زیادہ تھے۔ صناعتیں زیادہ ہیں مگر تکلفات اور زائد نکات سے وہ بھی بری ہیں چنانچہ فرماتے ہیں ق. وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (ق (حروف مقطعات سے ہے) قسم ہے قرآن بزرگی والے کی) یہاں تو قافیہ دال ہے آگے فرماتے ہیں۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَیْءٌ عَجِيْبٌ

(انہوں نے تعجب کیا کہ انہی میں کا ایک رسول ڈرانے والا ان کی طرف بھیجا گیا اور کافروں نے کہا کہ یہ عجیب بات ہے) نہیں یہاں قافیہ با ہے علیٰ ہذا القیاس آگے دیکھئے کہ کچھ قافیہ وغیرہ کا اہتمام نہیں پس بتلا دیا کہ قافیہ وغیرہ کی ضرورت نہیں بلکہ حقائق و معانی کی ضرورت ہے۔

کیونکہ قرآن روحانی مطب ہے اور طب کی کتاب میں زیادہ اہتمام اس کا ہونا چاہئے کہ اس کے نسخے شفاء میں کامل ہوں لفظی نکات کا اس میں اہتمام نہیں ہوا کرتا۔

دیکھئے اگر حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے نسخہ میں گل بنفشہ اور کاسنی ہو تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ ان دونوں دواؤں میں قافیہ نہیں اس لئے یہ نسخہ ٹھیک نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ یہ نکتہ نہ مقصود ہے نہ قابل لحاظ ہے بلکہ مقصود شفا ہے چونکہ یہ نسخہ اس کے مناسب ہے اس لئے کامل ہے۔

علی ھذا القیاس احکام شرعیہ میں نکات مقصود نہیں بلکہ معرفت الٰہی مقصود ہے پس علماء محققین کی نظر اسی مقصود پر ہے کہ یہ نکات ان کی نظر میں کچھ بھی نہیں ظاہر ہے کہ جس کی نظر اشرفی پر ہو وہ پیسہ کوڑی کو کیا نظر میں لاوے گا۔ وہ معرفت الٰہی ایسی نعمت ہے کہ ان کا ہی دل جانتا ہے اس کے مزہ کے مقابلہ میں تمام دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں وہ معرفت سے ہروقت مزے لیتے ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہتے گو سب کچھ جانتے ہیں مگر

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز　　ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(اس بات میں مصلحت نہیں ہے کہ میں راز سے پردہ اٹھاؤں ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں کہ نہ ہو۔

جن فضلاء کو یہ معرفت حاصل نہیں اور جن کے آئینہ نظر میں یہ مقصود منکشف نہیں ہوا وہ ایسے نکات کے درپے ہوتے ہیں چنانچہ کوئی نکتہ وحدۃ الوجود میں غرق ہے کوئی وحدۃ الشہود میں لیکن انہیں نکتہ دانوں میں اگر کسی کو یہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو یہ نکات سب نظر سے گر جاتے ہیں پھر ان کا نام تک زبان پر نہیں آتا اور معرفت الٰہی سے سکون ہو جاتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے متعلق جو کہ صفائی کا داروغہ ہے گلیوں وغیرہ کی تحقیق ہو اگر وہ وزیر اعظم ہو جاوے تو اب ان قصوں کو اس کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اب اس کو خدمت و رضائے شاہی ہر وقت مدنظر رہے گی۔ پس جماعت وغیرہ میں جو یہ نکتے اتفاق کے بیان کئے جاتے ہیں میں اس کی نفی نہیں کرتا ہوں بلکہ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ حکم شرعی اس مصلحت اتفاق پر مبنی نہیں ہے۔ حکم شرعی پر خود یہ نکات مبنی اور اس کے تابع ہیں حکم شرعی کی وضع تو ایسی بناء پر ہے جس کا ہم کو علم بھی نہیں ہے۔ ہم کو تو اس قدر علم کافی ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جس کو اللہ کے رسول نے ہم تک پہنچایا ہے اور پس ہمارا مشرب یہ ہونا چاہیے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو　　نینگیختن علت از کار تو

(میں تو تیرا نام لے کر زبان کو تر و تازہ کرتا ہوں مجھے تیرے کاموں سے کوئی غرض نہیں ہے۔)

ہمارے لئے بڑی بنا اس حکم کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو مقرر کیا ہے البتہ جس حکم کی حکمت خود اللہ تعالیٰ نے بتلا دی ہے اس کو بے تکلف بیان کیجئے باقی جس حکم کی مصلحت خود انہوں نے نہیں بتائی اس میں اپنی رائے کو دخل دینا اور اپنی مزعومہ حکمت پر حکم کو مبنی کرنا بڑی حماقت اور سراسر نادانی ہے مثلاً پھول پتی اور گلکاری پر تعمیر مبنی نہیں بلکہ تعمیر پر یہ سب گلکاریاں مبنی ہیں ہماری مصلحتیں بالکل پھولوں کی مثل ہیں اور مقصود اعظم عمارت ہے نہ کہ پھول پتی۔ بس سمجھ لو کہ نماز و جماعت اس وجہ سے مقرر نہیں ہوئی تاکہ اتفاق اس پر مرتب ہو بلکہ اتفاق سے حکم شرعی پر یہ مصلحت اتفاق بھی تابع ہو کر مبنی ہو گئی۔

میں نے ایک کتاب لکھی ہے "المصالح العقلیہ فی الاحکام النقلیہ" جس میں احکام شرعیہ کی کچھ حکمتیں بیان کی گئی ہیں مگر اس کتاب میں جو چیز زیادہ پسندیدہ اور کارآمد ہے وہ اس کا خطبہ ہے۔ جس میں چند مفید قواعد

اور فوائد ہیں۔ اس میں یہ فائدہ بھی مذکور ہے کہ یہ نکات مذکورہ حکم شرعی کے تابع ہیں ان پر حکم شرعی مبنی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کے لئے بھی عیدگاہ میں حاضر ہونے کا حکم فرمایا تھا تو اس سے ثابت ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی اہتمام کے ساتھ قولاً بھی عیدگاہ میں جانے کا اہتمام کیا ہے۔ حضورؐ کا عملی اہتمام یہ ہے کہ آپ ہمیشہ عیدگاہ میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے صرف ایک بار بارش کی شدت سے تشریف نہیں لے گئے۔

تعریف سنت مؤکدہ

لیکن یہ آپ کا تشریف نہ لے جانا اپنے ذاتی آرام و راحت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ محض امت پر شفقت کی وجہ سے تھا۔ بعض اعمال مستحبہ گاہ آپ نے اس لئے چھوڑ دیئے ہیں کہ کہیں امت دقت میں نہ پڑ جائے چنانچہ آپ نے صحابہ کو نماز تراویح چند روز پڑھائی اور پھر چھوڑ دی۔ صحابہؓ نہایت ذوق وشوق سے تراویح کے لئے مسجد میں حاضر ہوئے مگر آپ اپنے حجرہ اعتکاف سے تشریف نہ لائے۔ صحابہ نے اس خیال سے کہ شاید آپ سو رہے ہوں گے کھانسنا کھنکارنا شروع کیا تا کہ آپ بیدار ہو جائیں اور ہمیں تراویح پڑھادیں مگر آپ تشریف نہ لائے۔ مجبوراً صحابہؓ واپس چلے گئے۔ صبح کو جب صحابہؓ خدمت شریف میں حاضر ہوئے تب آپ نے فرمایا کہ مجھ کو تمہارے رات کے آنے کی خبر ہے مگر میں قصداً نہیں نکلا اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ اجتماع پسندیدہ ہے۔ مجھ کو خوف ہوا کہ کہیں تم پر یہ نماز یعنی تراویح فرض نہ ہو جائیں اور تم دقت میں پڑ جاؤ اس وجہ سے پھر آپ نے تراویح جماعت سے نہیں پڑھی لیکن اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو آپ ضرور جماعت تراویح پر مواظبت فرماتے جیسا کہ یہ ارشاد بتلا رہا ہے پس مواظبت حقیقیہ گو نہیں مگر مواظبت حکمیہ ثابت ہے اسی لئے حضرات صحابہؓ نے بعد میں تراویح پر مواظبت کی اور اسی لئے تراویح سنت مؤکدہ ہے چونکہ یہ زمانہ ترجمہ کا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ سنت مؤکدہ کی تعریف کر دی جائے تا کہ جو شبہ تراویح کے سنت مؤکدہ ہونے پر واقع ہوتا ہے وہ دفع ہو جائے۔

تعریف سنت مؤکدہ کی یہ ہے کہ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مداومت کی ہو۔ اب اس میں شبہ یہ پیدا ہوا کہ بعض احادیث کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تراویح باجماعت فصل کے ساتھ صرف تین روز پڑھی ہے پس معلوم ہوا کہ حضورؐ نے اس پر مداومت نہیں کی تو تراویح سنت مؤکدہ نہ ہوئی۔ اس شبہ کی بنیاد محض ترجمہ اردو کا دیکھنا ہے اور محض ترجمہ کے دیکھنے سے اصل حقیقت ہرگز سمجھ میں نہیں آ سکتی بلکہ یہ علوم کی تحصیل پر موقوف ہے اور آج کل سرے سے علوم ہی حاصل نہیں کئے جاتے بس اپنی خواہش کے موافق جو دل میں آیا سمجھ لیا اور جو چاہا کرنے لگے گو غلط ہی سمجھا ہو غرض علمائے محققین نے احکام میں کبھی لم و کیف نہیں کہا حالانکہ ان کو علوم بھی حاصل تھے اور اب تو

لوگ محض ترجمے دیکھ کر احکام کے ساتھ تمسخر اور گستاخی اور خودرائی کرنے لگے حالانکہ محض ترجمہ کا دیکھنا ہرگز کافی نہیں ہوسکتا ترجمہ کے دیکھنے والے اول تو کہاں تک ترجمہ دیکھ سکتے ہیں پھر کہاں تک یاد رکھ سکتے ہیں پھر کہاں تک صحیح سمجھ سکتے ہیں آج کل تو خیر سے حفظ کی قوت ہی نہیں بس یہ حال ہوگا۔

حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء (تم نے ایک چیز یاد رکھی اور بہت سے بھلا دی)

تجربہ ہے ترجمہ میں کچھ نہ کچھ ضرور رہ جاتا ہے اس لئے استعداد علمی کی ضرورت ہے۔ محض ترجمہ دیکھ کر غلطی ہو جانے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مولوی صاحب پٹنہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے انہوں نے سفر حج کیا ان کے پاس ایک کتاب سفرنامہ حج تھی وہ اس سفر میں جو کام کرتے اس کتاب کو دیکھ کر کرتے تھے۔ اس کتاب میں یہ واقعہ بھی لکھا تھا کہ عرب میں یہ عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے قیمتی لباس والے بھیک مانگتے ہیں۔ اتفاق سے ایک دن جعفر آفندی جو پاشا کا مترجم تھا اور باوجود ہندی ہونے کے زبان ترکی وغیرہ پر قادر تھا اور شان وشوکت سے تھا۔ ان مولوی صاحب کے سامنے آیا اور آکر سلام کیا۔ مولوی صاحب سخت لہجے میں کہنے لگے کہ کچھ کہنا ہے جعفر آفندی خوش مزاج بھی تھا کہا ہاں چار روز کا بھوکا ہوں کچھ مدد کیجئے مولوی صاحب نے کہا کہ یہ لباس فروخت کردو اور کھاؤ تم کو ایسے لباس کے ساتھ سوال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ جعفر نے کہا کہ لباس بیچ دوں گا تو بھیک کیسے ملے گی۔ اس لباس کے لحاظ سے تو کوئی روپے دو روپے دے بھی دیتا ہے اور یہ نہ ہو تو دو چار ہی آنے پر ٹرخا دیا کریں گے۔ خیر آفندی ہی گفتگو کر کے اس وقت تو چلے گئے۔ پھر ایک دن یہ مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے جعفر آفندی گزرے میں نے ان کو بلایا اور تعظیم کی۔ یہ مولوی صاحب حیران ہوئے کہ میں نے تو ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا تھا اور یہاں معاملہ بالعکس ہے۔ آخر ان مولوی صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں میں نے کہا ایک معزز شخص ہیں وغیرہ وغیرہ تب تو مولوی صاحب نہایت شرمندہ ہوئے اب جعفر آفندی نے مزاحاً مجھ سے کہا کہ ذرا ان مولوی صاحب سے دریافت کیجئے کہ انہوں نے مجھ سے بے رخی کا برتاؤ کیوں کیا۔ وہ بیچارے بہت معذرت کرنے لگے پھر میں نے دریافت کیا کہ آخر آپ نے ان کے ساتھ ایسا بدنما برتاؤ کیوں کیا تو مولوی صاحب فرمانے لگے کہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ بعض لوگ عرب میں عمدہ لباس پہن کر لوگوں کے پاس جاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں وہ مکار دھوکہ باز ہوتے ہیں اور علاوہ کتاب میں دیکھنے کے میں نے ایسے لوگ آنکھوں سے بھی دیکھے میں نے یہی سمجھ کر ان کے ساتھ یہ معاملہ کیا میں سمجھا کہ یہ بھی کوئی سائل ہیں جو اس شان سے آرہے ہیں۔ جعفر آفندی بہت خوش طبع تھے فوراً بولے کہ اجی مولوی صاحب آپ نے جن لوگوں کو بھیک مانگتے دیکھا وہ عمامہ

باندھے تھے یا ترکی ٹوپی پہنے اس مولوی صاحب نے کہا واقعی عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ جعفر نے کہا کہ حضرت میں تو ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا نہ کہ عمامہ باندھے ہوئے آپ نے مجھ کو ان پر کیسے قیاس کر لیا۔ سچ ہے یک من علم را دہ من عقل باید محض کتاب دیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کافی ذریعہ معلومات کا نہ ہو۔ اسی طرح سے نرے ترجمہ سے کام نہیں چلتا بلکہ عقل و استعداد کی بہت ضرورت ہے ورنہ محض ترجمہ دیکھنے والے بہت غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جیسے یہ مولوی صاحب تھے۔

غرض سنت مؤکدہ کی تعریف کا یہ مقدمہ تو صحیح ہے کہ جس فعل پر حضورؐ نے مداومت فرمائی ہو وہ سنت مؤکدہ ہے لیکن اس مقدمہ کے سمجھنے کیلئے نری ترجمہ بینی کافی نہیں بلکہ استعداد علمی کی بھی ضرورت ہے۔

اب سنو کہ مداومت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مداومت حقیقیہ اور دوسری مداومت حکمیہ۔ مداومت حقیقیہ تو یہ ہے کہ کسی فعل کو صورۃً بھی ہمیشہ کیا جاوے اور مداومت حکمیہ یہ ہے کہ کسی فعل کو صورۃً تو کسی مصلحت کی وجہ سے کبھی چھوڑ دیا ہو لیکن ارادہ میں اس فعل پر دوام ہو اور حضورؐ کے ارادہ کو بھی بجائے فعل کے موثر سمجھنا چاہیے اور حضور کا ارادہ دوام تراویح کے متعلق خود اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور آپ نے جماعت تراویح پر مداومت اس وجہ سے نہیں کی تا کہ یہ فرض نہ ہو جائے۔ اور امت وقت میں نہ پڑ جائے۔ یہ غایت درجہ کی امت پر شفقت ہے۔ یہ مصلحت امت تھی ترک دوام صوری میں چونکہ مداومت حکمیہ ارادیہ جو بمنزلہ فعل کے ہے۔ حضورؐ سے ثابت ہو چکی تو یہ تراویح کی سنت مؤکدہ ہونے کی کافی بلکہ اکمل دلیل ہے۔

شان محبت

صاحبو! واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری وجہ سے عمر بھر تکلیف اٹھائی کہ بعض دفعہ ایک کام کو آپ کا جی چاہتا تھا مگر ہماری مشقت کے خیال سے نہ کرتے تھے تو کیا ہم کو آپ کی خوشی کے لئے مشقت نہ برداشت کرنا چاہیے۔ جب کہ ہم کو حدیث سے معلوم ہو گیا کہ تراویح کی جماعت اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اور حضورؐ کا بھی دل چاہتا تھا کہ اس پر مواظبت کریں مگر آپ نے ہماری وقت خیال سے صورۃً مواظبت نہیں کی تو کیا ہم کو اس پر مواظبت نہ کرنا چاہیے ضرور چاہیے۔

صحابہ کرام نے اس راز کو سمجھا ہے کیونکہ ان کو حضورؐ سے محبت تھی اور محبت کی یہ شان ہے کہ محبوب کی گذشتہ تکلیف تک سے محب متاثر ہوتا ہے تو اس کے احکام و مرضیات سے تو کیوں متاثر نہ ہوتا۔ صاحبو! اصل یہ ہے کہ جیسی صحابہ کرام کو حضور پرنورؐ سے محبت تھی ہم کو ویسی محبت ہی نہیں۔ بعض صحابہؓ کی محبت کا یہ لون تھا کہ تمام عمر گزر گئی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکے کیونکہ محبت کا اختلاف استعداد محب سے ہے ایک یہ قاعدہ بھی ہے کہ جب غایت درجہ کی محبت ہو جاتی ہے تو محبوب کے دیکھنے کی تاب نہیں رہتی خوب کہا ہے۔ ؎

یوں کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو آ جاتا　　　سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے　　　تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

غرض بعض صحابہ کو اس رنگ کی بھی محبت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ کسی نے ایک صحابی سے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ شریف دریافت کیا تو کہا کہ یہ تو اس سے پوچھو جس نے حضور کو آنکھ بھر کر دیکھا ہو یہاں تو تمام عمر گزر گئی کبھی آنکھوں کو تاب نہ ہوئی کہ نگاہ بھر کر اس پر جمال کو دیکھ سکیں بیان کروں تو کیا بیان کروں۔

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　　گوش رانیز حدیث تو شنیدن ندہم
بخدا کہ رشکم آید زدو چشم روشن خود　　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(یہ سبب غیرت کے اپنی آنکھوں کو تجھے دیکھنے نہیں دیتا اور اپنے کانوں کو آپ کی باتیں سننے نہیں دیتا مجھے اپنی ان دو روشن آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ آپ کے چہرہ انور کو یہ بے حجاب دیکھتی ہیں۔)

صحابہ حضور کی محبت میں بے چین تھے حتیٰ کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گذشتہ تکلیف کو یاد کر کے بے چین ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی کے دسترخوان پر عمدہ گوشت آیا فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کی تکلیف یاد آ گئی تو زار زار آنسو جاری ہو گئے۔ کھانا اٹھا دیا اور نہ کھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری وجہ سے بہت فاقہ کشی کی ہے کہ مہینوں چولہے میں آگ تک نہیں جلی یہ ضرور ہے کہ یہ فاقہ دنیا کے کم ہونے کی وجہ سے اٹھایا لیکن خود دنیا کی کمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری محبت ہی کی وجہ سے اختیار کی کیونکہ جانتے تھے کہ امت میری عاشق ہے وہ میرا اقتداء کرے گی اگر میں دنیا کو لوں گا تو امت اس کو سنت خیال کر کے دنیا کے پیچھے چل پڑے گی اور مجھ کو تو دنیا کے اختیار کرنے سے کچھ ضرر نہ ہوگا مگر اس کی وجہ سے امت طرح طرح کی مضرتیں اٹھائے گی۔ بعض لوگ اس سنت کو آڑ بنا کر دنیا کی طلب ایسے طریقہ سے کریں گے کہ گنہگار ہو کر عنداللہ ماخوذ ہوں گے۔ جو اعلیٰ درجہ کی تکلیف کا باعث ہے اس وجہ سے آپ نے دنیا کو چھوڑا اور فاقہ کی تکلیف اٹھائی۔

ہر فعل ماثور مسنون ہے

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ضرور نہیں کہ جس فعل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کر لیں وہ ہر حال میں مسنون ہی ہو اگر ایسا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض افعال کو ہمارے خیال سے ترک کیوں کرتے؟ کیونکہ وہ تو سنت ہوتا پھر مضر کیوں ہوتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ بعض دفعہ فعل ماثور بھی غلو کی وجہ سے مضر ہو جاتا ہے یہ خوب یاد رکھئے کہ ہر فعل ماثور ہر حال میں ہر صورت میں موجب ثواب نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ فعل ماثور بعض عوارض کی وجہ سے بالعکس معصیت ہو جاتا ہے۔ دیکھئے ولیمہ سنت ہے لیکن اس

کے ساتھ ہی بعض صورتوں میں اس سے ممانعت بھی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
شر الطعام طعام الولیمة یدعی لها الاغنیاء ویترک لها الفقراء الخ. (صحیح مسلم)
یعنی کھانوں میں برا کھانا اس ولیمہ کا ہے جس میں امراء کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے۔
دیکھئے ولیمہ سنت ہے لیکن اس عارض ترک یا طرد فقراء کی وجہ سے شر ہو گیا۔ افسوس آج کل اکثر ولیمے اسی قسم کے ہوتے ہیں جن میں محض برادری کے معززین کو بلایا جاتا ہے اور غرباء کو نہیں پوچھا جاتا بلکہ اس جگہ سے نکال دیا جاتا ہے حالانکہ جن فقراء کو ولیمہ سے نکالا جاتا ہے ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **هل تنصرون وترزقون الا بضعفائکم** (حلیۃ الاولیاء)
تمہاری جو مدد کی جاتی ہے اور تمہیں جو رزق دیا جاتا ہے وہ فقراء وضعفاء ہی کی وجہ سے تو دیا جاتا ہے۔ پس نہایت بے حیائی ہے کہ جن کی وجہ سے یہ رزق دیا گیا ہے انہیں کو اس رزق سے دھکے دیئے جائیں۔
ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر مخلوق میں ایسے بوڑھے نہ ہوتے جن کی کمریں جھک گئی ہیں اور بہائم نہ ہوتے اور شیر خوار بچے نہ ہوتے تو تم پر عذاب کی بارش ہوتی۔ معلوم ہوا کہ ہم عذاب خداوندی سے بوڑھے اور بچوں بہائم وغیرہ کی وجہ سے بچے ہوئے ہیں۔

رحمت کا مذہب

صاحبو! شریعت مطہرہ نے بہائم کے بھی حقوق تعلیم کیے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں جانوروں کے حقوق بیان کئے ہیں اسلام نے سب کے حقوق بالتفصیل بتادیئے ہیں چنانچہ بہائم کے بھی کچھ حقوق ہیں اور کیوں نہ ہوں جب ان کی برکت سے ہم سے عذاب ٹلا ہوا ہے اسی طرح غریبوں کی وجہ سے ہماری مدد ہوتی ہے اور ہم کو رزق دیا جاتا ہے پھر غرباء کو دھکے دینا بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے۔ الحاصل ولیمہ اسی حد تک مسنون ہے جس حد کو اسلام نے متعین کر دیا ہے کہ جس میں غرباء بھی ہوں اور حسب طاقت ہو سودی قرض سے نہ کیا گیا ہو اور اس میں ریا اور سمعہ کو دخل نہ ہو اور تکلفات نہ ہوں خالصاً لوجہ اللہ ہو وہ ولیمہ مسنون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جو سب سے بڑا ولیمہ تھا اس میں محض ایک بکری ذبح کی گئی تھی۔ آپ نے کر کے دکھلا دیا کہ اس طرح کام کیا کرتے ہیں۔
اس حدیث سے ایک مشہور اشکال کا بھی جواب ہو گیا۔ وہ یہ کہ بعض فرقے اسلام کو بے رحم بتلاتے ہیں اس وجہ سے کہ اسلام نے ذبح بہائم کو جائز رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام بے رحم ہوتا تو ہرگز بہائم کے حقوق کی تعلیم نہ کرتا اور اجازت دیتا کہ بہائم کے ساتھ جس طرح چاہو معاملہ کرو خواہ سختی کا خواہ نرمی کا حالانکہ اسلام پکار رہا ہے کہ بہائم کے حقوق کا لحاظ رکھو ان پر بے جا سختی مت کرو

جو کام ان کے متعلق ہو وہ لے لو پھر راحت دو طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ لادو اور جب سفر کرو تو کبھی کبھی راستہ میں ان کو گھاس چرنے کی بھی مہلت دیدیا کرو اور جانوروں کو ہانکتے ہوئے ان کو گالی نہ دیا کرو اور منزل پر پہنچ کر ان کو زین وغیرہ سے الگ کردو اور پہلے ان کے چارہ کا انتظام کر کے پھر کسی اور کام میں لگو اس کے علاوہ بہت سے حقوق ہیں جن کی تفصیل میرے رسالہ ارشاد الهائم فی حقوق البهائم" میں مذکور ہے جن کی نظیر کوئی باطل مذہب نہیں دکھا سکتا۔ رہی ذبح بہائم کی اجازت تو نہ یہ بے رحمی ہے نہ اس میں جانور کو تکلیف ہوتی ہے جس کی تفصیل آئندہ (اس مقام کے بعد جہاں حضرت نوح علیہ السلام سے برتن بنوانے اور پھر تڑوانے کا قصہ مذکور ہے) آئے گی۔

ذبح بقرہ

بعض مسلمان ہنود کے میل جول کی وجہ سے گائے کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اسلام کچھ گوشت خوری پر موقوف نہیں۔ اسلام میں گوشت کھانا اور نہ کھانا دونوں یکساں ہیں۔ گائے کا گوشت نہ کھایا تو بکری کا کھالیا اس میں کیا حرج ہے گائے کا گوشت کھانا فرض تھوڑا ہی ہے۔

افسوس ان لوگوں نے شریعت خداوندی کے مقابلہ میں اپنی ایک شریعت گھڑلی ہے ان لوگوں نے یہ مسئلہ ہنود سے لیا اس لئے کہ ہنود بھی یہی کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت مت کھاؤ کہ رحم کے خلاف ہے۔ بکری وغیرہ کا کھاؤ۔ حالانکہ یہ قول بالکل عقل سے بھی بعید ہے اس واسطے کہ جو بے رحمی گائے کے ذبح میں ہے وہی بے رحمی بکری وغیرہ تمام جانوروں کی ذبح میں ہے۔ اگر بکری وغیرہ کا ذبح بے رحمی نہیں گائے کا ذبح بھی بے رحمی نہیں۔ اب ہم کو بتلایا جائے کہ گائے کا ذبح کیوں بے رحمی ہے اور بکری کا ذبح کیوں بے رحمی نہیں؟

بعض کہتے ہیں کہ گائے کے ذبح میں دودھ گھی میں کمی آجاتی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ گائے سے زیادہ دودھ گھی بھینس کا ہوتا ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہندو اور ان کے حامی مسلمان گائے کے ذبح سے روکتے ہیں اور بھینس کے ذبح کی اجازت دیتے ہیں حالانکہ اس میں دودھ گھی کا نقصان بہت زیادہ ہے گائے کا دودھ گھی تو بیماروں کو بتلایا جاتا ہے۔ تندرست آدمی تو اکثر بھینس کا دودھ گھی استعمال کرتے ہیں مگر اسکے ذبح پر کسی کو اعتراض نہیں نہ یہ بے رحمی شمار کیا جاتا ہے۔ ہاں گائے کے ذبح پر ہندوؤں کا بھی اعتراض ہے اور بعض مسلمان بھی ان کی حمایت کرتے ہیں۔

صاحبو! یہ دلائل تو محض بہانے ہیں اصل بات یہ ہے کہ گائے ہندوؤں کا معبود ہے۔ اس کا ذبح اس لئے ان کو ناگوار پھر ان مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ جس اغراض کا منشاء شرک ہے اس میں وہ ہندوؤں کی موافقت وحمایت کرتے ہیں۔ غرض اپنی خواہش کے موافق جس کو چاہا کھالیا جس کو جی نہ چاہا نہ کھایا۔

ایسے مسلمانوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کسی نے تمام قرآن میں سے دو چیزیں پسند کی تھیں احکام میں سے تو وُكُلُوْا وَاشْرَبُوْا کھاؤ اور پیو۔ اور دعاؤں میں سے یہ دعا رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے اللہ آسمان سے ہم پر دسترخوان اتار۔ پس جس طرح اس شخص نے اپنی خواہش کے مطابق قرآن پاک سے صرف دو چیزیں چھانٹیں اور باقی کو چھوڑ دیا اسی طرح ان مسلمانوں نے بھی حسب خواہش کچھ جانور اپنے لئے اختیار کر لئے اور باقی جانور جو شریعت اسلام میں حلال ہیں چھوڑ دیئے۔

صاحبو! گائے کا کھانا اگرچہ اسلام میں مباح ہی ہے واجب اور فرض نہیں لیکن کسی فرقہ مخالف اسلام کی دلجوئی وخوشنودی کی غرض سے اور وہ بھی محض مردار دنیا کے لئے اس کا چھوڑنا سخت گناہ ہے اور اسلام کی کھلی مخالفت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترک دنیا کی وجہ

یہ تو جملہ معترضہ تھا اب اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں۔ مقصود یہ ہے کہ حضورؐ نے دنیا کو اس واسطے پسند نہ کیا کہ آپ جانتے تھے کہ میرے اس فعل سے امت مشقت میں پڑ جائے گی۔ اور یہ دنیا ان کو مضر ہوگی ورنہ آپ کے لئے کیا کمی تھی اگر آپ دنیا چاہتے تو تمام دنیا غلام بن کر تابع ہو جاتی اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے دنیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہتی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کی معرفت آپؐ کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ اگر آپؐ دنیا لینا چاہیں تو جبل احد کو سونے کا بنا کر اس طرح تابع کر دیں کہ اگر آپؐ سفر میں بھی تشریف لے جائیں تو یہ آپؐ کے ہمراہ رہے آپؐ نے فرمایا۔ "اے اللہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز فاقہ رہے اور ایک روز کھانا ملے فاقہ کے روز صبر کروں اور کھانے کے دن شکر کروں۔ یہ کیوں؟ محض ہمارے لئے کیونکہ ہمارے لئے دنیا مضر تھی ورنہ آپ کے لئے کچھ بھی مضر نہ تھی۔

اس کے متعلق ایک مرتبہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کامل کے پاس دنیا ایسی ہے جیسے منتر جاننے والے کے پاس سانپ اور ناقص کے پاس دنیا ایسی ہے جیسے منتر سے ناواقف کے پاس سانپ۔ منتر جاننے والے کے پاس سانپ ہو تو مضر نہیں بخلاف ناواقف کے کہ اس کے ہاتھ میں سانپ مضر ہے۔ جب کامل اور ناقص میں یہ فرق ہے پھر حضورؐ تو اکمل الکاملین تھے۔ آپ کو دنیا کیا مضر ہوتی مگر باوجود عدم مضرت کے پھر آپ نے دنیا کو صرف اس واسطے نہ لیا کہ میرے بعض امتی میرے اس فعل کو آڑ بنا کر دنیا پر گر جاویں گے اور مضرتیں اٹھاویں گے۔

دیکھا آپ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت پر کس قدر شفقت تھی اسی وجہ سے آپ نے

بہت سے کام جو آپ کر سکتے تھے اور کرنا بھی چاہتے تھے صرف ہماری مضرت کے خوف سے بوجہ ہم پر شفقت کے نہ کیے۔ چنانچہ آپ بارش میں نماز عیدگاہ میں جا کر ادا کر سکتے تھے کیونکہ بارش کو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب رکھتے تھے چنانچہ جب بارش ہوتی تو آپؐ اپنا کرتہ اتار کر بدن پر لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ پانی تازہ بتازہ میرے خدا کی طرف سے آیا ہے۔

قوت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اور اس کے علاوہ آپ کوئی نازک اور کمزور بھی نہ تھے بلکہ طبعی طور سے حضورؐ کا مزاج بہت قوی تھا۔ چنانچہ آپ کی نو بیبیاں تھیں اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شب میں تمام بیبیوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ کتنی کامل قوت کی دلیل ہے۔ پھر یہ ابتدائی جوانی کا واقعہ نہیں۔ جوانی میں تو آپ نے ایک نکاح سے زیادہ نہیں کیا تھا۔ یہ نو بیبیاں آپ کے پاس اس وقت تھیں جب کہ پچاس سے آپ کی عمر متجاوز ہو گئی تھی۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ آپ میں تیس مردوں کی قوت تھی۔

محققین (قلت رواہ الترمذی مجاہد مرسلا ۱۲ ظ) نے فرمایا ہے کہ دنیا کے مردوں کی نہیں بلکہ جنت کے مردوں کی اور جنت کے ایک مرد میں سو مردوں کی قوت ہے۔ اس حساب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تین ہزار مردوں کی قوت ہوئی اور معمولی مرد کے لئے اسلام نے چار عورتوں کی اجازت دی ہے تو اس حساب سے آپ کے لئے بارہ ہزار عورتوں کی اجازت ہوتی مگر باوجود اتنی قوت کے آپ نے صرف نو بیبیوں کو اختیار کیا جن کو آپ کی قوت کے اعتبار سے عشر عشیر کی بھی نسبت نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کے نفس کش تھے کہ دنیا بھر میں آپ کا نفس کشی میں کوئی نظیر نہیں مل سکتا۔

ظاہر ہے کہ جس کو بارہ ہزار روٹیوں کی خواہش ہو اور یہ مقدار بلا کسی مزاحم اور بلا مانع و بلا مشقت کے ہر طرح سے اس کو میسر بھی ہو سکتی ہو پھر بھی وہ صرف نو روٹیوں پر اکتفا کرے تو یہ نفس کشی نہیں تو اور کیا ہے کیا کوئی عاقل سوا معاند کے ایسے شخص کو عیش پرستی کا نام دے سکتا ہے۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا یہ حال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف تریسٹھ سال تھی مگر تمام بال سیاہ تھے۔ بجز چند بالوں کے جن کو شمار بیس سے بھی کم تھی کہ وہ سفید تھے۔ اور یہ حالت بے فکری کی وجہ سے نہ تھی۔ حضورؐ کو تو طرح طرح کی ایسی فکریں تھیں کہ دنیا میں کسی کو بھی نہیں ہو سکتیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دائم الحزن طویل الفکرۃ** (لم اَجد الحدیث فی موسوعۃ) یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکر اور غم ہی میں رہتے تھے۔ رات دن میں کوئی آن ایسی نہ تھی کہ فکر سے خالی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ قسم ہے اللہ کی اگر تم ان امور کو

دیکھو جن کو میں دیکھتا ہوں اور تم کو ان باتوں کی خبر ہو جاوے۔ جن کی مجھ کو خبر ہے تو تم عمر بھر روتے پھرو اور ہنسنا بھول جاؤ۔ میں اسرافیل کو دیکھ رہا ہوں جو صور کو منہ میں لئے کھڑے ہیں حکم کے منتظر ہیں کہ اب حکم ہو اور اس میں پھونک ماردوں کہ سارا عالم درہم برہم ہو جاوے۔ ایسی حالت میں مجھ کو کیسے چین آئے اور میں کیسے بے فکر ہو بیٹھوں۔ ایک روایت میں ہے۔ **شیبتنی سورۃ ھود** (مشکوۃ المصابیح) (مجھے سورہ ھود نے بوڑھا کر دیا) باوجودیکہ ایسی فکر اور تریسٹھ سال کی عمر پھر بھی بیس بال تک سفید نہ ہوں۔ یہ نہایت قوۃ مزاج کی دلیل ہے۔ غرض آپ نازک مزاج اور کمزور نہ تھے کہ بارش میں چلنا دشوار ہوتا موت سے زیادہ تو کوئی مصیبت نہیں مگر جب اولیاء اللہ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ موت کو دوست رکھتے ہیں اور اس دن کی تمنا کرتے ہیں اس لئے کہ یہ وسیلہ ہے محبوب سے ملنے کا۔

خرم آنروز کزیں منزل ویران بروم — راحت جاں طلبم و زپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے — تادر میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(میں اس روز بہت خوش ہوں گا جب اس دنیا سے جاؤں گا راحت جان حاصل ہوگی اور میں محبوب کے پاس حاضر ہوں گا میں نے یہ نذر مانی ہے کہ جب یہ مبارک دن آئے گا تو میں میکدہ کی طرف غزلیں پڑھتا ہوا خوش خوش جاؤں گا۔) تو حضورؐ اس ذرا سی بارش سے کیا ڈرتے یہ محض امت پر شفقت تھی۔

غرض یہ ہے کہ آپؐ نے صرف ایک مرتبہ مسجد میں عید کی نماز پڑھی اور تمام عمر عیدگاہ میں نماز پڑھی اور حیض والی عورتوں تک کو عیدگاہ میں آنے کا آپؐ نے حکم فرمایا جس سے عیدگاہ میں آنے کی عظمت اور اہتمام شان ظاہر ہے گو بعد میں احادیث ہی سے سمجھ کر صحابہ نے اس سے روک دیا۔

تارک قربانی کے لئے وعید

مگر اسی کے ساتھ حضورؐ کا حکم ہے کہ جس نے باوجود وسعت کے قربانی نہ کی ہو وہ ہمارے مصلی (عیدگاہ) کے قریب نہ آئے۔ یوں نہیں فرمایا کہ عیدگاہ میں نہ آوے بلکہ یوں فرمایا کہ اس کے قریب تک بھی نہ آئے۔ قربانی نہ کرنے والے سے کس قدر نفرت معلوم ہوتی ہے کہ ایسے شخص کو حکم دیا کہ مصلے مسلمین کے پاس تک نہ پھٹکے۔

صاحبو! اگر غیرت ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو تو بڑی سخت بات ہے مگر افسوس کہ اس قدر تو قربانی کی تاکید ہے مگر بعض مسلمان پھر بھی نہیں کرتے۔

برائے نام قربانی

اور بعض ایسے بھی ہیں کہ قربانی تو کرتے ہیں مگر محض برائے نام ہی کرتے ہیں خواہ عند اللہ مقبول

ہونے کے قابل ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ کانپور میں ایک لوہار تھے انہوں نے قربانی کے لئے ایک ایسا بکرا تجویز کیا جس میں سب ہی عیب تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ میاں ایسا جانور کیوں ذبح کرتے ہو۔ لوہار بولا واہ صاحب ہماری بیوی صاحبہ کا فتویٰ ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے اس شخص نے کہا کہ ذرا ہم کو بھی دکھلانا چاہیے کہ آپ کی بیوی نے کہاں سے فتویٰ دیا ہے۔ لوہار گھر گیا اور بیوی سے ذکر کیا کہ حضور کے فتویٰ کو بعض لوگ نہیں مانتے ذرا انہیں بھی قائل کردو۔ وہ اتفاق سے اردو پڑھی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً اردو کا شرح وقایہ نکال کر دکھلایا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ جس جانور کے تہائی سے کم دم وکان ناک وغیرہ کٹی ہوں وہ جائز ہے اس بکری میں چونکہ ہر چیز تہائی سے کم کٹی ہوئی ہے اور یہ عیب موثر نہیں لہذا جائز ہے اس شخص نے کہا کہ بھائی ہم شرح وقایہ تو سمجھتے نہیں علماء کے پاس چلو اور یہ جانور ان کو دکھلا لو پھر وہ جو حکم دیں۔ لوہار کہنے لگا کہ بس صاحب ہم کو تو ہماری بیوی کا فتویٰ کافی ہے کسی عالم کو دکھلانے کی حاجت نہیں۔ بس اس لوہار کو صرف قربانی کا نام کرنا تھا۔

فضیلت قربانی

غرض بعض لوگ برائے نام قربانی کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قربانی کی عظمت ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ اس وقت میں اس کی عظمت ہی ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ اب اس حدیث کا ترجمہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس حدیث کے دو جز ہیں ایک جز میں تو فضیلت قربانی کی بیان فرمائی ہے اور دوسرے جز میں حقیقت قربانی بیان فرمائی ہے۔ یعنی جب حضور نے قربانی کی فضیلت یہ فرمائی ہے کہ ہر ہر بال کے عوض نیکیاں ملتی ہیں تو صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول حقیقت قربانی کی کیا ہے؟

حقیقی ادب

صحابہؓ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش مزاج پاتے تھے تو سوال کر لیا کرتے تھے اور حضور اگر مناسب سمجھتے جواب دے دیتے تھے ورنہ منع فرما دیتے تھے۔ چنانچہ مسئلہ تقدیر میں گفتگو کرنے سے آپ نے صحابہؓ کو منع فرمایا کہ اس میں گفتگو مت کرو۔ تمہاری فہم سے بالا ہے۔ جس طرح حکم خداوندی ہے مان لو اس کے بعد صحابہؓ جواب کے لئے اصرار نہیں کرتے تھے۔ اور یہ عدم اصرار غایت ادب کی وجہ سے تھا صحابہؓ کا بے حد ادب کرتے تھے اور طریق ادب میں بہت ہی کامل تھے۔ صاحبو! عالم بن جانا آسان ہے مگر ادب نہایت مشکل ہے ادب کا طریقہ ہر شخص نہیں جانتا۔ بعض طریقے ادب کے ایسے ہیں کہ اہل علم بھی نہ جانتے ہیں نہ سمجھتے ہیں گو درسی علم رکھتے ہیں مگر ادب جاننا اس کے لوازم سے نہیں بقول عارف شیرازیؒ

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد ... بندہ طلعت آن باش کہ آنے سازد

(معشوق وہ نہیں جو ناز وادا رکھتا ہو بلکہ تو اس کا عاشق بن جو کچھ آن بان رکھتا ہو۔)

نہ ہر کہ چہرہ برا فروخت دلبری داند　　نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(نہ ہر خوب صورت چہرے والا دلبری جانتا ہے جیسے ہر وہ شخص جس کے پاس آئینہ ہو سکندر نہیں ہوتا۔)

ہزار نکتہ باریک ترزمو اینجاست　　نہ ہر کہ سر بتر اشد قلندری داند

(اس میں بال سے بھی باریک ہزاروں نکتے موجود ہیں ہر وہ شخص جو سر منڈائے قلندر نہیں ہوتا)

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

(محبوبوں کی صرف چٹک مٹک ہی ان کے قابل التفات ادائیں نہیں ہیں بلکہ ان کی بہت سی ادائیں ایسی ہیں جن کا کچھ نام نہیں ہے۔)

ادب کے متعلق مجھے بلگرام کی ایک حکایت یاد آئی۔ بلگرام میں ایک بزرگ تھے۔ ان کی خدمت میں ان کے ایک شاگرد سبق پڑھنے آئے دیکھا کہ چہرہ مرجھایا ہوا ہے سمجھ گئے کہ آج فاقہ ہے۔ عرض کیا کہ حضرت آج مجھے سبق پڑھنے سے عذر ہے اجازت چاہتا ہوں کہ سبق ملتوی رکھا جائے۔ اجازت لے کر اٹھے اور گھر جا کر بہت سا کھانا لے کر خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت اس کو قبول فرمالیجئے۔

فرمایا کھانا تو ایسے وقت آیا ہے کہ واقعی مجھے حاجت ہے مگر ایک عذر شرعی کی وجہ سے نہیں قبول کر سکتا۔ عرض کیا حضرت وہ عذر کیا ہے۔ فرمایا حدیث شریف میں آیا ہے جو چیز تمہارے پاس بغیر اشراف نفس یعنی بغیر انتظار و طمع نفس کے آئے اس کو لے لو ورنہ نہیں۔ اے بیٹا جب تم میرے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اسی وقت میرے نفس میں آیا تھا کہ یہ کھانا لینے گئے ہیں اس وقت سے اب تک نفس کو اس اس کھانے کا انتظار تھا۔ لہٰذا میں اس کھانے کو قبول نہیں کر سکتا۔ سبحان اللہ یہ ہے اتباع سنت کہ حاجت شدیدہ میں بھی اتباع سنت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ایک ہم ہیں کہ ضرورت کے وقت فرائض کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

پھر دوسرا کمال یہ کہ اپنی احتیاج کو بھی ظاہر کر دیا اور نفس کے انتظار کی بھی قلعی کھول دی۔ جو کچھ بات تھی سچ سچ بیان کر دی نہ کچھ تصنع کیا نہ بناوٹ۔ صاحب جس کے پاس کھرا مال ہوگا وہ خریداروں کی پرواہ نہیں کیا کرتا بلکہ خود خریدار اس کی پرواہ کیا کرتے ہیں اور جس کے پاس کھوٹا مال ہوتا ہے وہ طرح طرح کی بناوٹیں کر کر کے خریداروں کو جماتا ہے۔ بس جو واقعی اہل اللہ ہیں ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ ہمارا کوئی معتقد رہے گا یا نہیں بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ بہتر ہو کہ کوئی ہمارا معتقد ہی نہ ہو کیونکہ ان کے معمولات میں مخلوق کی آمد و رفت سے نقصان ہوتا ہے گو وہ اپنی خوش اخلاقی سے کسی کو منع نہ فرمائیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ فلاں اپنے مرید کو منع کر دیجئے

کہ وہ فلاں کام نہ کرے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا اثر آپ تک پہنچے کہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ میاں کسی پر کیوں رکھتے ہو تمہارا جی چاہتا ہو بدگمان ہونے کو تو ہو جاؤ اور میاں تم نے تو گویا مجھے بڑی دھمکی دی ہے کہ لوگ بدگمان ہو جائیں گے اور تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ مجھے تو تمہارے اس اعتقاد نے پریشان کر رکھا ہے۔ بہت اچھا ہو کہ مجھ سے لوگوں کا اعتقاد جاتا رہے کوئی میرے پاس نہ آئے بس تنہا میں ہوں اور میرا اللہ ہو بقول جامیؒ۔

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے　　　که یارے برخورد از وصل یارے

(کتنا اچھا وقت اور کیسا عمدہ زمانہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے وصل سے لطف اندوز ہو رہا ہے)

بعض دفعہ اہل اللہ خود اس کی تدبیر کیا کرتے ہیں کہ کوئی ہمارا معتقد نہ رہے چنانچہ حضرت مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ سے میرٹھ میں معتقدین نے وعظ کے لئے درخواست کی تو آپ نے جس وقت وعظ شروع کیا تو مولوی عبدالقیوم صاحب کو جو اس وقت بچے تھے اپنے زانو پر بٹھلا لیا اور درمیان وعظ کے کبھی کبھی ان سے فرماتے گال پھلاؤ وہ پھلاتے اور آپ اس کو پچکا دیتے۔ غرض اسی قسم کی حرکات عین وعظ میں کرتے رہے اور یہ افعال اس غرض سے کئے جا رہے تھے تاکہ لوگ غیر معتقد ہو جائیں مگر کوئی غیر معتقد نہ ہوا پھر وعظ کے بعد ایک بہت بڑے رئیس مصافحہ کے لئے آگے بڑھے آپ نے ان کی ناک پکڑ کر ہلا دی۔ اس رئیس نے عرض کیا کہ حضرت ہماری عقیدت ایسی نہیں ہے کہ ایسے افعال کی وجہ سے ہم آپ کو چھوڑ دیں۔ غرض بعض بزرگ خود ایسے افعال کرنے لگتے ہیں کہ مخلوق خود بخود ہم سے بھاگ جائے اور معتقدوں کے کم ہونے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ ان کا یہ مذاق ہوتا ہے کہ

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں　　　مانمی خواہیم ننگ و نام را

(اگرچہ ایسے افعال عقلمندوں کے نزدیک بدنامی کا باعث ہیں لیکن میں تو نام و نمود چاہتا نہیں) اور یہ ہوتا ہے کہ

ساقیا برخیز دو رہ جام را　　　خاک برسر کن غم ایام را

(اے ساقی اٹھ اور جام لا اور غم ایام کی پریشانی کو بھلا دے)

ایک بار یہی مولانا شہیدؒ لکھنؤ تشریف لائے تو ایک شہزادہ زیارت کو حاضر ہوا اور حسب دستور اودھ شہزادہ نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے تین دفعہ فرشی سلام کیا۔ مولانا علیہ الرحمۃ نے تینوں دفعہ انگوٹھا دکھلا دیا۔ شہزادہ شرمندہ ہوا اور برہم ہو کر مجمع حاضرین میں بیٹھ گیا۔ جب واپس ہونے لگا تو ایک اشرفی مولانا کی نذر کی مولانا نے منہ چڑا دیا شہزادہ تو غصہ ہو کر چلا گیا۔ بعد میں حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت وہ تو سلام کرتا تھا اور آپ انگوٹھا دکھلاتے تھے یہ کیا بات تھی۔ فرمایا شریعت میں تو اس طرح سلام ہے نہیں۔ میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ وہ یوں کہتا ہے کہ میری قسمت پھوٹ

گئی۔ میں نے کہا کہ میرے ٹھینگے سے۔ غرض اولیاء اللہ دل کی بات صاف کہہ دیتے ہیں کسی کے غیر معتقد ہونے سے نہ ڈرتے ہیں نہ کسی کے معتقد ہونے کی پرواہ کرتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ان بلگرامی بزرگ صاحب نے صاف کہہ دیا کہ نفس کو اس کھانے کا انتظار ہو گیا تھا اس وجہ سے میں نہیں لیتا اور یہ عذر شرعی ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو چیز بدوں انتظار کے آئے وہ لے لو۔

اور اس سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ جو چیز انتظار کے بعد آئے وہ نہ لو۔ اگر اس موقع پر ہم ہوتے تو اصرار کرتے کہ نہیں حضرت لے ہی لیجئے۔ قبول ہی فرمالیجئے۔ جیسا دستور ہے مگر وہ شاگرد نہایت سمجھدار و فہیم تھے اور طریقہ ادب سے واقف اور سچی محبت کرنے والے تھے انہوں نے ذرا بھی اصرار نہ کیا (اب تو محض رسم پرستی ہے محبت وادب کچھ نہیں ہے) چنانچہ یہ کہہ کر بہت اچھا فوراً کھانا واپس لے گئے اور نظر سے غائب ہو کر پھر فوراً واپس ہو آ گئے اور کھانا پیش کر کے عرض کیا کہ حضرت اب تو نفس کو وہ انتظار نہ رہا تھا بلکہ نفس مایوس ہو چکا تھا کہ آیا ہوا کھانا جاتا رہا۔ سو اب تو قبول فرمالیجئے۔ اب تو عذر شرعی بھی نہ رہا۔ وہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور دعا دی۔

غرض رسول کے غلبہ سے طرز ادب مشکل ہے اور حقائق پر نظر ہو تو کچھ مشکل بھی نہیں وہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے محبت کی ضرورت ہے مگر آج کل تو محبت کا دعویٰ ہی دعویٰ ہوتا ہے اگر سچی محبت ہو تو خود محبت ہی طرز خدمت سکھا دیتی ہے۔ (قال الشاعر)

محبت مجھ کو آداب محبت خود سکھا دے گی ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کر

حضرت صدیق اکبرؓ نے قبل از اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ خدمت کرنا چاہی جبکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے آپ کا نکاح ٹھہرا تو حضرت خدیجہؓ بڑی امیر تھیں بڑی عاقل بھی تھیں۔ تجارت کے ذریعہ سے مال بڑھاتی تھیں یہاں تک کہ بہت سے غلام اور جانور آپ کے پاس تھے۔ نقدی بھی بہت کچھ تھا ادھر حضورؐ کے یہاں مال زیادہ نہ تھا لیکن حضور کا خاندان ہمیشہ سے معظم اور رئیس سمجھا جاتا تھا گو دعویٰ نبوت سے وشان ریاست عامہ کی نہ رہی تھی کیونکہ لوگ مخالف ہو گئے مگر بعد میں پھر پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔

تو صدیق اکبرؓ نے چاہا کہ اس وقت کچھ آپ کی خدمت روپے سے کروں تا کہ خدیجہؓ کے سامنے آپ کی بات ہلکی نہ ہو۔ اگر خرچ نہ ہوا تو بات ہلکی ہو جائے گی۔ اس وقت صدیق اکبرؓ بہت مالدار تھے مگر ساتھ ہی یہ خیال کرتے تھے کہ میری اس خدمت کو آپ کیوں قبول کرنے لگے۔ آپ کو غیرت وحیا اس کے قبول سے مانع ہو گی۔ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ آپ قبول فرمالیں وہ تدبیر یہ کی کہ عرض کیا کہ حضورؐ آپ کے دادا صاحب نے غالباً میرے دادا کے پاس کچھ امانت رکھی تھی وہ لے لیجئے۔ اس طریقہ سے روپیہ دیا اور آپ نے قبول فرمالیا۔

تو دیکھئے حضرت صدیق اکبرؓ ابھی اسلام بھی نہیں لائے تھے مگر چونکہ آپ کو حضورؐ سے سچی محبت تھی اس نے خدمت کا یہ طریقہ خود بخود ان کو سکھلا دیا۔ الحاصل ادب کے سبب صحابہ کا یہ مذاق تھا کہ حضورؐ سے ایک بات پوچھی اگر آپ خاموش ہو گئے تو پھر جواب پر اصرار نہیں کرتے تھے پھر کسی دوسرے وقت اگر ضرورت سمجھتے تو موقع محل دیکھ کر مکرر عرض کر کے جواب حاصل کر لیتے تھے۔

حقیقت قربانی

غرض جب فضیلت قربانی کی صحابہؓ نے سنی تو عرض کیا کہ یا رسول اللہ حقیقت قربانی کی کیا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا **سنة ابیکم ابراھیم** (کنز العمال) یعنی تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ اور سنت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو جو آپؐ نے باپ فرمایا یا تو اس لئے فرمایا کہ مخاطب عرب ہیں اور اکثر عرب کا سلسلہ نسبی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے تو اس صورت میں ابراہیم کا باپ ہونا حقیقۃً ہوگا اور اگر مخاطب کل امت کو مانا جاوے اس صورت میں ابراہیم علیہ السلام کا کل امت کے لئے باپ ہونا مجازاً ہوگا یعنی روحانی باپ وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے روح اور نفس کی اصلاح ہو اور ہماری روحانی اصلاح کا سلسلہ ابراہیم علیہ السلام تک پہنچتا ہے لہٰذا وہ ساری امت کے روحانی باپ ہیں۔ تو باپ کے پہلے معنی ظاہری ہیں اور دوسرے معنی باطنی۔

اور اتفاق سے اسی طرح خود مقصود حدیث بھی دو معنی کو مشتمل ہے یعنی جس طرح ابیکم میں ایک ظاہری معنی ہیں ایک باطنی معنی اسی طرح سنت ابراہیم کے دو معنی ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **لکل آیة ظھر وبطن** (لم اجد الحدیث فی موسوعة) یعنی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن میں اسکی تحقیق بھی مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ظاہر اور باطن کے کیا معنی ہیں بیان اس کا یہ ہے کہ بعض معانی تو وہ ہیں کہ جو مدلول قرآن بدلالت لغویہ ہوں۔ اور بعض وہ ہیں جو مدلول بدلالت لغویہ نہ ہوں پھر اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ معنی کسی طرح سے بھی مدلول قرآنی نہ ہوں نہ بواسطہ نہ بلاواسطہ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ معنی مدلول قرآنی ہوں لیکن بلاواسطہ نہیں بلکہ بواسطہ ہوں پس اگر قرآن کے ایسے معنی گھڑے جائیں جو قرآن کا کسی طرح مدلول نہ ہو تو یہ معنی بالکل غلط ہوں گے اور یہ مسلک فرقہ باطنیہ کا ہے۔ جیسے **اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ** میں فرقہ باطنیہ نے اس کے یہ معنی لئے ہیں کہ اے روح تو نفس کے پاس جا یعنی ان کے نزدیک موسیٰ سے مراد روح اور فرعون سے مراد نفس ہے اور اس فرقہ نے قصہ موسیٰ و فرعون کو تو بالکل ہی اڑا دیا ہے جو مدلول قرآنی بدلالت ظاہرہ تھا اور اپنی طرف سے ایک نئے معنی گھڑ لئے۔ محققین صوفیہ نے اس کی نسبت فرمایا ہے کہ یہ فرقہ باطنیہ ملحد ہے جو مسلمانوں کا لباس پہن کر اسلام کو مٹانا چاہتا ہے اور محققین صوفیہ نے برخلاف اس فرقہ باطنیہ کے اس آیت کی دو توجیہیں کی ہیں ایک یہ کہ اے

موسیٰ فرعون کی طرف جا۔ یہ معنی تو مدلول قرآنی بدلالت ظاہرہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ۔ الخ دوسرے معنی بواسطہ یہ کئے ہیں کہ اے قرآن کے دیکھنے والے اور قرآن کے پڑھنے والے جب تو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصہ کو پڑھے تو اس قصہ پر اپنے حال کو قیاس کر۔ یعنی تیرے اندر جو منشاء ہے اعمال صالحہ کا یعنی روح جو مثل موسیٰ کے ہے اس کو قوت پہنچا کر اس کے ذریعہ سے نفس کی جو کہ افعال قبیحہ کا منشاء ہونے میں مثل فرعون کے ہے مغلوب کر۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

موسیٰ و فرعون در ہستی تست (موسیٰ اور فرعون دونوں تیری ذات میں موجود ہیں)

یہ معنی بھی مدلول قرآنی ہیں لیکن بواسطہ ایک قسم کے قیاس کے کیونکہ اس کی حقیقت یہ کہ اس قصہ ظاہرہ سے سبق لے کر اپنے نفس میں اس کو جاری کیا گیا ہے پس دراصل یہ تفسیر نہیں بلکہ ایک قسم کا قیاس ہے جو اصطلاح میں اعتبار کہلاتا ہے دوسروں کے قصہ سے عبرت حاصل کرنا اور عبرت حاصل کرنے کے یہی معنی ہیں کہ اپنی حالت میں غور کر کے دیکھا جائے کہ میرے اندر تو اس قصہ کے مشابہ کوئی حالت نہیں ہے اگر ہے تو جو نتیجہ قصہ کے اندر مذکور ہے اس سے متنبہ ہونا چاہیے۔

اور اعتبار کا حق تعالیٰ نے امر فرمایا ہے کہ قرآن کے قصوں سے عبرت حاصل کرو چنانچہ ایک جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُولِي الْاَلْبَاب. کہ ان لوگوں کے قصہ میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے اور اس صورت میں مدلول ظاہری بھی منفی نہ ہوگا بلکہ عبرت حاصل کرنے کے لئے اصل قصہ کو بحال خود رکھنا لازم ہوگا۔ غرض ہر آیت کے اسی طرح دو معنی ہیں ظاہر اور باطن اور ہر معنی نہایت عجیب ولطیف ہیں۔ اسی باب میں کہا گیا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت رابو ارباب معنی را

(اس کے حسن کی بہار ہمارے دل و جان کو تازہ کر دیتی ہے جو ظاہر پرست ہیں وہ صورت سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو باطن کے طلب گار ہیں وہ معنی سے لطف اندوز ہوتے ہیں)

قرآن عجیب کلام ہے جس سے ہر شخص اپنی استعداد کے موافق حصہ لیتا ہے اہل ظاہر ظاہری معنی سے اور اہل باطن باطنی و ظاہری دونوں سے۔

چیست قرآن اے کلام حق شناس رونمائے رب ناس آمد بہ ناس
حرف حرفش راست در بر معنی معنی در معنی در معنی

(قرآن کیا ہے حق کو پہچاننے والے لوگوں کے لئے ان کے رب کو دیکھنے کا ایک ذریعہ ہے اس کا حرف حرف بہت سے معنی کو متضمن ہے کہ معنی میں معنی پھر ان میں معنی پوشیدہ ہیں۔)

اسی طرح حدیث کو سمجھ لیجئے۔ غرض ہر نص کا ایک ظاہر ہے ایک باطن یا یوں کہئے کہ ایک

صورت ہے ایک حقیقت۔ اسی طرح یہاں بھی قربانی کا سنت ابراہیم ہونا جو کہ مقصود حیات ہے اس کا ایک ظاہر ہے ایک بطن۔ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کے ذبح کا حکم ہوا تو مدلول ظاہری تو اس کا یہی ذبح ولد تھا اور بطن وہ ہے جو کہ رات میرے ذہن میں آیا ہے جس کی تفصیل ابھی آتی ہے۔ سنئے کہ جب صحابہ نے اضحیہ کی حقیقت دریافت کی تو آپ نے فرمایا سنة ابیکم ابراهیم (السنن الکبری للبیہقی) یعنی یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے۔

تعلیم پدری اور آداب فرزندی

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ باپ کا طریقہ کیا ہے سو ظاہر ہے کہ باپ کا طریقہ وہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے پس اس طریقہ کو قرآن ہی سے تحقیق کرنا چاہیے پس قرآن کا جو مطالعہ کیا گیا تو علوم ہوا کہ وہ طریقہ ولد کو ذبح کرنا ہے کیونکہ دنبہ کے ذبح کا حکم قرآن میں مذکور نہیں بلکہ اولاً بیٹے ہی کے ذبح کا قصہ مذکور ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فعل ذبح ولد ہی تھا نہ کہ ذبح کبش پس نص قرآنی کا ظاہر یہی ہے کہ یہ سنت ابراہیم جو حدیث میں مذکور ہے ذبح ولد ہو۔

چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح ولد کا خواب دیکھا تھا چونکہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے لہٰذا اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مذبح میں لے گئے اور وہاں ان سے اپنا خواب اس طرح بیان کیا: يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى.

اے میرے پیارے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔ سو دیکھو اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟

سبحان اللہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کیا عجیب اور سہل طریقہ ہے کہ مخاطب پر بالکل بوجھ نہیں ڈالتے بلکہ ان سے سوال کرتے ہیں اور اس طریقہ خاص کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب بشاش ہو کر تعلیم کو ضرور قبول کر لیتا ہے۔ یہ طرز تعلیم نہایت موثر ہوتا ہے باوجودیکہ ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ ذبح اسماعیل علیہ السلام کا پختہ تھا مگر پھر بھی یوں نہیں فرمایا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے میں تجھ کو یہاں ذبح کرنے کے واسطے لایا ہوں تو ذبح کے لئے تیار ہو جا۔ آپ نے اس مضمون کو جو طبعاً نہایت سخت اور خوف میں ڈالنے والا تھا کس سہل عنوان سے بیان فرمایا کہ اے بیٹے میں نے یہ خواب دیکھا ہے بولو تمہاری کیا رائے ہے۔ گویا ان سے مشورہ لیا اور اس کی تعبیر پوچھی۔ اب بھی اگر کوئی شخص اس طرز تعلیم کو اختیار کرے تو نہایت مؤثر اور نافع خلوق ہوگا۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں ایک شخص حاضر ہوا آپ نے دیکھا کہ اس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہے۔ جب

وعظ ختم ہوا اور لوگ چلنے لگے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ ذرا آپ ٹھہر جائیں مجھ کو آپ سے ایک کام ہے۔ جب سب چلے گئے تو آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے تم کو اس لئے روکا ہے کہ بھائی ذرا میرے پاجامہ کو دیکھو مجھ کو شبہ یہ ہو جاتا ہے کہ میرا پاجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے آیا یہ میرا خیال ہی خیال ہے یا واقعی ٹخنوں سے نیچا ہے کیونکہ جس کا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہو گا وہ دوزخ میں جائے گا وغیرہ وغیرہ تو بھائی دوزخ کا سخت عذاب ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ذرا اچھی طرح میرے پاجامہ کو دیکھ لو۔ یہ سنتے ہی وہ شخص شرما گیا اور پیروں میں گر پڑا اور کہا کہ حضرت آپ کا پاجامہ تو نہیں لٹکتا ہے البتہ مجھ نالائق کو لٹکتا ہے میں توبہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہ ہو گا۔

غرض نرمی سے تدبیر سے بہت کام بنتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَقُلْ لِّعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ یعنی اے نبی میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بات کریں جو بہتر ہو یعنی اس میں خشونت واشتعال نہ ہو یعنی بلاضرورت اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو علیحدہ لے گئے اور خواب بیان کر کے فرمایا کہ اس میں تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس عنوان کو اختیار کیا اور صاف صاف جو بات تھی وہ نہ کہی گو اس میں بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اس احتمال کا شبہ ہو سکتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کا بچپن ہے کہیں ذبح سے گھبرا کر خلاف نہ کہنے لگیں مگر ان کا یہ خیال راجح تھا کہ

؎ شاباش آں صدف کہ چناں پرورد گوہر　　آبا از و مکرم و ابنا عزیز تر

(اے صدف تجھے مبارک ہو کہ تو نے اس عمدہ گوہر کو پرورش کیا ہے کہ باپ دادا کی تکریم کا باعث ہے)

یہ ایسا واقعہ تھا جیسا کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے خرچ میں بھی اضافہ فرما دیجئے کیونکہ اب تو فتوحات زیادہ ہونے لگی ہیں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ الخ چونکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ کو خاص محبت تھی اس لئے آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کو مضمون آیت مذکورہ کا سنایا یعنی اے نبی اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیا کی طالب ہو تو میں تم کو کچھ دے کر علیحدہ کر دوں پھر مجھ سے تمہارا کچھ تعلق نہ رہے گا اور اگر دنیا کو چھوڑ کر مجھ کو اور اللہ کو اختیار کرو تو تمہارے واسطے اللہ نے آخرت میں بڑے بڑے اجر رکھے ہیں چونکہ حضرت عائشہ کم سن تھیں کیونکہ جب وہ آپ کے گھر میں آئی تھیں تو ان کی نو سال کی عمر تھی اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اٹھارہ سال کی تھیں اور چونکہ اس عمر میں تدبر اور تجربہ عادۃً کم ہوتا ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو احتمال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ عائشہؓ بلا سوچے سمجھے دنیا کو اختیار کر لیں تو فرمایا اے عائشہ جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر کے جواب دینا اور ماں باپ کے متعلق یہ شبہ نہ تھا مگر حضرت عائشہؓ کی نسبت حضور کا یہ خیال درجہ احتیاط میں تھا ورنہ ہر ایک کے سینہ میں حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کی محبت اعلیٰ پیمانہ پر ایسا جوش مار رہی تھی جس کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی ہیچ تھی۔

یہ سنتے ہی فوراً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے بارہ میں میں اپنے ماں باپ سے مشورہ کروں گی۔

قد اخترت اللہ ورسولہ والدار الآخرۃ میں نے اللہ کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دار آخرت کو اختیار کیا چونکہ حضرت عائشہؓ کا بچپن تھا اس لئے ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ یا رسول اللہ کہ اگر دوسری بیویاں آپ سے دریافت کریں کہ عائشہؓ نے کیا جواب دیا تو آپ نہ بتلائیں۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ اگر کسی نے پوچھا تو میں بتلا دوں گا کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے احکام کا ظاہر کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اسی طرح اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ مشورہ کرتے ہوئے کچھ خیال ہوا بھی ہو کہ دیکھئے اسماعیل کیا جواب دیتے ہیں تو وہ درجہ احتیاط میں ہوگا ورنہ خود ان کی استعداد فطری میں یہ احتمال کی گنجائش نہ تھی۔

عظیم آزمائش

چنانچہ حضرت اسماعیل نے فوراً یہی عرض کیا کہ میں اس کا جواب ہی کیا دوں بس اللہ نے جو حکم آپ کو دیا ہے کہ گزریئے اور اگر آپ کو یہ شبہ ہو کہ میں اس وقت تو پختہ ہوں مگر شاید عین وقت پر ثابت قدم نہ رہوں تو سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ یعنی ان شاء اللہ مجھ کو آپ ثابت قدم پائیں گے۔ بس یہ سن کر ابراہیم علیہ السلام ذبح کے لئے تیار ہو گئے اور زمین پر لٹا کر تیز چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر زور زور سے پھیرنے لگے لیکن چھری تھی کہ نہیں چلتی تھی اس وقت ادھر سے یہ ہوا: وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ...... بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ. یعنی ہم نے ان کو پکارا کہ اے ابراہیم تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھلا دیا۔ (ہم مخلصین کو ایسے ہی جزا عطا فرماتے ہیں) بیشک یہ کھلا ہوا بڑا امتحان تھا اور ہم نے اسماعیل کو ایک ذبح عظیم کے ساتھ بدلہ کر کے چھڑا لیا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ جنت سے ایک دنبہ لایا گیا جو اسمٰعیل علیہ السلام کے بدلہ میں ذبح ہوا۔ واقعی اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سخت امتحان تھا یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص حالت مغلوبیت و بدحواسی میں اپنے ایسے فرزند کو جو بہت تمناؤں کے بعد بڑھاپے میں پیدا ہوا ہو ذبح کر دے لیکن ہوش و حواس کی حالت میں ہرگز ہمت نہیں ہو سکتی بلکہ ذبح ولد کے بجائے خودکشی نہایت آسان ہے اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ فعل نہایت درستی حواس میں تھا بدحواسی اور مغلوبیت کا یہاں شبہ تک نہیں ہو سکتا۔

اس لئے انبیاء علیہم السلام کبھی اس درجہ مغلوب الحال نہیں ہوتے کہ حقائق ان کے ادراک سے غائب ہو جاویں۔ البتہ اولیاء بعض اوقات بیشک اس درجہ مغلوب الحال ہو جاتے ہیں۔ دوسرے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا. (اے ابراہیم علیہ السلام آپ نے خواب سچا

کر دکھایا) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کو حکم کی تعمیل کی نیت سے قصداً کیا جیسا صدق کی اسناد سے معلوم ہوتا ہے اور غلبہ حال میں قصد کامل نہیں ہوتا۔ تیسرے آگے فرماتے ہیں۔ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ. (بلاشبہ یہ کھلم کھلا بڑا امتحان تھا) کہ یہ بڑا سخت امتحان تھا اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے باختیار خود بحالت درستی حواس یہ کام کیا تھا کیونکہ امتحان اسی کا ہوتا ہے جو ہوش وحواس میں ہو بدحواس آدمی جو کچھ کرتا ہے بے اختیاری میں کرتا ہے اور وہاں منجانب اللہ کوئی امتحان نہیں ہوتا۔ غرض بدحواسی سے انبیاء معصوم ہیں۔

ہاں اولیاء کو بعض اوقات یہ حالت پیش آتی ہے چنانچہ حسین بن منصور علیہ الرحمۃ مغلوب الحال تھے۔ کہ غلبہ حال میں انا الحق کہہ گئے اور گو وہ اس میں معذور تھے مگر یہ حالت زیادہ کمال کی نہیں۔ اسی لئے شیخ عبدالحق ردولویؒ نے ان کے باب میں فرمایا ہے۔

منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد برآمد　　　　اینجا مرد انند کہ دریاہا فرو برند و آروغ نہ زنند

حالانکہ یہ بزرگ ردولویؒ بھی مغلوب الحال تھے کہ عمر بھر گھر سے جا کر مسجد میں نماز پڑھی لیکن کبھی مسجد کا راستہ یاد نہ ہوا ہمیشہ خادم آگے آگے حق حق کہہ کر مسجد میں لے جاتا تھا۔ نیز حضرت مخدوم احمد صابر بھی مغلوب الحال تھے مگر باوجود اس حالت کے شریعت کے خلاف کوئی امر سرزد نہیں ہوا شریعت کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ بخلاف اس زمانہ کے صوفیوں کے کہ باوجود مغلوب ومعذور نہ ہونے کے ان کا بڑا مایہ کمال یہی ہے کہ وہ وجد وحال میں شریعت کا کچھ لحاظ نہیں کرتے۔ جماعت کا وقت ہے لیکن صوفی صاحب حال وقال میں ہیں کچھ خبر نہیں کہ جماعت کدھر ہے۔ اور نماز کدھر ہے کئی کئی وقت کی نمازیں ترک کر دیتے ہیں اور اگر کسی نے پڑھی بھی تو بعض دفعہ اتفاقاً بیہوش ہو کر گر بھی پڑے مگر پھر بھی اسی حالت سے اٹھے اور نماز پڑھ لی حالانکہ بیہوش ہو کر گرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے مگر ان کو شریعت کی بالکل خبر نہیں۔ وضو تک کے مسائل بھی یاد نہیں پھر باوجود اس کے علماء سے پوچھتے بھی تو نہیں۔ بس معلوم ہوا کہ شریعت کی پرواہ ہی نہیں کرتے البتہ اہل وجد وسماع میں سے ایک درویش نے ایک مرتبہ مجھ سے یہ مسئلہ دریافت کیا تھا کہ میں نے ایک شخص کو بددعا دی تھی وہ مر گیا میرے ذمہ خون تو نہیں ہوا عمر بھر میں یہ ایک شخص ایسا ملا جس کو باوجود سماع میں مبتلا ہونے کے شریعت کا پاس تھا۔ یہاں سے یہ جواب دیا گیا کہ اگر محض بددعا تھی اور قلبی ہمت کو کچھ دخل نہیں تھا تو اگر وہ محل بددعا نہ تھا تو محض بددعا کا گناہ ہوا قتل کا نہیں ہوا اور اگر دل سے بھی ہمت کی تھی تو قتل کا بھی گناہ ہوا اگر وہ شخص شرعاً مستحق قتل نہ ہو۔ غرض زمانہ حال کے متعارف صوفیہ میں ایسے بہت کم ہیں جو خدا سے ڈریں۔ اکثر تو زمانہ حال کی صوفیت کا مآل کسب دنیا ہے

جس قدر مریدین کی کثرت ہو گویا جائیداد بڑھتی ہے حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمۃ ایک مرتبہ فرماتے تھے آج کل پیروں کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی مرید ان کی خدمت میں آتا اگر اس سے اتفاق سے سر بھی کھجلایا تو معاً پیر صاحب کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید عمامہ سے نذرانہ نکالتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایسی مغلوبیت شان ولایت ہے۔ انبیاء کی یہ شان نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مغلوب الحال نہ تھے۔ اسی لئے آپ کا یہ فعل بہت بڑا امتحان تھا۔

اب سنئے کہ اس مقام پر ابراہیم علیہ السلام سے دو فعل صادر ہوئے ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش۔ شاید یہ شبہ ہو کہ دو فعل کہاں ہوئے کیونکہ یہاں تو فقط دنبہ ذبح ہوا تھا نہ کہ بیٹا یہ شبہ ایک شرعی قاعدہ کے سننے کے بعد بالکل رفع ہو جائے گا وہ یہ کہ شریعت میں ثواب وعقاب کا دارومدار ارادہ مصمم فعل اختیاری پر ہے خواہ وہ فعل کسی مانع یا عدم شرائط کی وجہ سے وقوع میں نہ آئے۔ ایسی صورت میں چونکہ اس شخص کی طرف سے فعل اختیاری کا ارادہ مصمم ہو چکا تھا لہٰذا موجب ثواب یا عقاب ضرور ہوگا۔ مثلاً ایک شخص ارادہ مصمم زنا کا کر کے چلا اور خاص موقع پر پہنچا اور زنا کرنے کو تیار ہو بیٹھا اتفاق سے چھت گر پڑی اور دب کر مر گیا تو حالانکہ اس شخص نے زنا نہیں کیا مگر چونکہ ارادہ مصمم ہو چکا تھا لہٰذا شرعاً زانی ہو کر مرا علیٰ ہذا نماز کا مصمم ارادہ کر کے کھڑا ہوا اور اسی طرح زلزلہ سے چھت گر گئی تو نماز کا اجر اس کو مل گیا۔

پس اسی طرح یہاں ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ذبح ولد کا ہوا تو انہوں نے فوراً ارادہ بھی مصمم کر لیا اور اس فعل ذبح کو کر بھی ڈالا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ اور فعل دونوں وقوع میں آئے کیونکہ ذبح کے معنی ہیں امرار السکین علی الحلقوم یعنی چھری کا گلے پر پھیرنا اور یہ فعل ابراہیم علیہ السلام سے بطریق اتم صادر ہوا تو پس ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ولد کو ذبح بھی کر ڈالا اور مستحق اجر عظیم ہوئے۔

رہا اس ذبح کرنے کے بعد ولد کا ذبح بھی ہو جانا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فعل نہیں بلکہ اثر ہے فعل کا جس پر ثواب وعقاب کا دارومدار نہیں نہ یہ فعل کوئی ضروری ہے یہ ایک جدا امر ہے۔ اور قاعدہ شرعیہ مذکورہ کو باری تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ یعنی تمہارے دلوں میں جو ارادے ہیں ان کو تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ سب سے محاسبہ کرے گا ان ارادوں سے مصمم ارادے مراد ہیں۔

مقصود قربانی

دوسرے انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے اور انبیاء کی وحی سچی ہوتی ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے ذبح ولد کو خواب میں دیکھا تھا تو یہ وحی بھی سچی ہوگی لہٰذا ذبح ولد کو ثابت ماننا پڑے گا۔ شرعاً بھی اور لغۃً بھی گو اند

باح کا وقوع نہ ہوا ہو پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے بجائے اسماعیل علیہ السلام کے دنبہ ذبح کرادیا یہ تو اس اضحیہ کا ظاہر ہوا اور اس کا بطن یہ ہے کہ حقیقت میں نفس کا ذبح کرنا مطلوب تھا جو بذریعہ ذبح ولد حاصل ہوا۔ لکل آیۃ ظھر و بطن (ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن) کے اصل پر یہ ہے اضحیہ کا یعنی جس طرح ہر عبادت کی ایک صورت ہوتی ہے یعنی ظہر اور ایک روح ہوتی ہے یعنی بطن اسی طرح اس اضحیہ کی بھی جیسے ایک صورت ہے جو سب کو معلوم ہے اسی طرح ایک روح بھی ہے یعنی ذبح نفس کہ وہی ذبح ولد کی بھی روح ہے۔ تو حقیقت قربانی کی فناء نفس ہوئی اسی واسطے ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد کا حکم ہوا نہ کہ اپنی ذات کے ذبح کا اس لئے کہ اولاد کی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹنا جس قدر نفس پر شاق اور سخت ہے (اور واقعی بہت ہی بڑا سخت فعل ہے کہ تصور سے بھی دل کانپتا ہے) اپنی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹ لینا اس کے مقابلہ میں آسان ہے۔ کوئی باپ بحالت ہوش وحواس کبھی اس فعل کو گوارہ نہ کرے گا بلکہ اپنی جان دے دینا نہایت آسان اور سہل سمجھے گا اور فناء نفس کے یہی معنی ہیں کہ اپنی نفس کی مخالفت کرنا اور یہ معنی ذبح ولد میں خود اپنے کو ذبح کرنے سے بہت زیادہ موجود ہیں۔

پس اب بتلایئے یہ باطن کون سی نص کے خلاف ہے۔ یاد رکھو کہ محققین صوفیہ کی کوئی بات قرآن وحدیث کے خلاف نہیں ہوتی اگر ہو تو وہ تصوف نہیں زندقہ ہے مگر ان حقائق کے سمجھنے کے لئے صحبت محققین کی ضرورت ہے کتابوں کے دیکھنے سے معلوم نہیں ہوتے اور نہ محض فن دانی سے یہ معانی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ تصوف کوئی کتابی فن نہیں بلکہ یہ تو مجموعہ ہے علم وعمل کا اور یہ دونوں جب حاصل ہوتے ہیں کہ کسی شیخ کامل کے اپنے آپ کو سپرد کردے اور علم وعمل میں اس کا اتباع کامل کرے۔

قال را بگذار مرد حال شو   پیش مرد کاملے پامال شو

(باتیں چھوڑ وصاحب حال ہو کسی شیخ کامل کے سامنے پامال ہو جاؤ)

اور سپردگی کے بھی یہی معنی ہیں کہ جس طرح شیخ کامل اس نفس متکبر کی اصلاح فرمائے خواہ ظاہری بداخلاقی کی چھری سے خواہ خوش اخلاقی سے یہ طالب سب کو برداشت کرے اور سب کو اپنے لئے نہایت نافع خیال کر کے خوش ہو بلکہ ایسے پیر کا زیادہ احسان مند ہو جس کو عام لوگ بداخلاق سمجھتے ہیں حقیقت میں اس نفس متکبر کا علاج یہی ہے، جس کو لوگ بداخلاقی سمجھتے ہیں۔

محبت و اطاعت

بعض لوگ اپنے پیر سے محض اس بناء پر منحرف ہو جاتے ہیں کہ وہ مریدوں کے ساتھ ہری خوش اخلاقی کا معاملہ نہیں کرتا یہ محض نادانی ہے چنانچہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں پیر تو سخت مزاج ہیں کسی خوش اخلاق

پیر سے مرید ہونا چاہیے یہ بڑی سخت غلطی ہے اور ایسی پیری مریدی محض برائے نام ہے کچھ بھی نافع نہیں۔ پیری مریدی کا حاصل اصلاح نفس ہے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ تم اپنے کو پیر کے بالکل سپرد کردو کہ وہ حسب حال جس تدبیر سے چاہے اصلاح فرمائے سب کو قبول اور برداشت کرنا چاہیے ورنہ اگر اس کی تدابیر اصلاح کی برداشت کی قوت نہ ہو تو کسی پیر سے مرید ہی نہ ہونا چاہئے کیونکہ اگر کسی وقت پیر نے اصلاح کے لئے زجرو توبیخ فرمائی اور مرید کے نفس متکبر نے برداشت نہ کیا تو پیر کی برائی اس کے دل میں آئے گی پھر بجائے اصلاح کے طرح طرح کی بلاؤں میں مبتلا ہو جائے گا ایسے شخص کو یہی بہتر ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے۔

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی   پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(ہر زخم پر تو نا گواری کا اظہار کرتا ہے بھلا کہیں بغیر رگڑے تو آئینہ بھی بنتا ہے)

جس شخص کو آپریشن کا تحمل نہ ہو اس کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہی نہ چاہیے اور اگر جاؤ گے اور اس کے نزدیک آپریشن کی کیا ضرورت ہے تو وہ ضرور ایسا کرے گا ورنہ وہ ڈاکٹر نہیں بلکہ رہزن ہے۔

مولانا نے یہ شعر ایک قصہ کے اندر فرمایا ہے وہ قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی گودنے والے مصور سے کہا تھا کہ میرے بدن پر شیر کی تصویر بنا دے۔ اس نے کہا بہت اچھا اور ایک سوئی کا چوکا بدن میں لگایا تو اس شخص نے سسکی بھر کر کہا کہ میاں کیا بناتے ہو۔ کہا دم بنا رہا ہوں بولا کہ میاں دم کو چھوڑ دو دوسری شئے بناؤ۔ دم نہ ہوئی تو کیا شیر لنڈورا بھی تو ہوتا ہے۔ گودنے والے نے کان کا نقشہ گودنا شروع کیا پھر سسکی بھری اور پوچھا کیا بناتے ہو کہا کان کہنے لگا کہ اگر نہ ہوئے تو کیا شیر بوچھا بھی تو ہوتا ہے۔ کانوں کو چھوڑ دو اور کچھ بناؤ پھر اس نے اور جگہ سوئی لگائی تو وہ پوچھتا ہے کہ اب کیا بناتے ہو کہا پیٹ کہنے لگا اس کو پیٹ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو کچھ کھانا پینا تھوڑا ہی ہے۔ گودنے والے نے تنگ آ کر سوئی پھینک دی اور کہا کہ صاحب میں نے ایسا شیر نہیں دیکھا جس کے سر کان پیٹ اور دم کچھ بھی نہ ہو۔

شیر بے گوش و سروشکم کہ دید   ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

(بغیر کان، سر، اور پیٹ کا شیر کہاں دکھائی دیتا ہے ایسا شیر تو اللہ میاں نے بھی پیدا نہیں کیا)

بس مجھے معاف رکھئے آگے مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن   از چنیں شیر ژیاں بس دم مزن

(جب ایک سوئی کے چبھنے کی بھی برداشت نہیں ہے تو اپنے جسم پر شیر بنوانے کی تمنا نہ کرو) اور فرماتے ہیں۔

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی   پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(ہر زخم پر نا گواری کا اظہار کرتے ہو بھلا کہیں بغیر رگڑے آئینہ بن سکتا ہے)

غرض جیسا کہ یہ شخص عدم تحمل کی وجہ سے نقشہ شیر سے محروم رہا ایسے ہی وہ لوگ جو پیر کی اصلاح کی

برداشت نہیں کرتے۔ اصلاح نفس سے محروم اور محض کورے رہ جاتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جو پیر حسب حال مرید کبھی زجر و توبیخ سے پیش آتے اور کبھی شفقت سے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا پیر مریدین پر بہت ہی مہربان ہے اس کو مریدین کا نفع مدنظر ہے اپنی منفعت سے کچھ علاقہ نہیں۔

حضرت ابوسعید گنگوہیؒ جب بارادہ بیعت گنگوہ سے بلخ کو چلے جب اس شہر کے قریب پہنچے تو شیخ نظام الدین بلخیؒ کو جن کی خدمت میں یہ جارہے تھے خبر ہوئی تو شیخ اور اس شہر کا حاکم صاحبزادہ ابوسعید علیہ الرحمۃ کے استقبال کو آئے کیونکہ یہ شیخ نظام الدینؒ کے دادا شیخ عبدالقدوسؒ کے پوتے تھے۔ پس یہ سن کر کہ صاحبزادے تشریف لائے ہیں نہایت شاندار استقبال کے ساتھ ملاقات کی اور نہایت تلطف اور اخلاق سے پیش آئے۔ اس لئے کہ آخر صاحبزادے ہی تھے۔ بعد ملاقات وغیرہ کے دریافت کیا کہ صاحبزادے کیسے تکلیف فرمائی؟ عرض کیا بارادہ بیعت حاضر ہوا ہوں یہ سنتے ہی فوراً تیور بدل گئے۔ اب کہاں کا اخلاق کہاں کی شفقت کہا بہت بہتر جاؤ باورچی خانہ کی خدمت تمہارے سپرد ہے اور فرمایا فلاں مدت تک میرے سامنے نہ آنا چونکہ آدمی بنانا مقصود تھا اور اس میں بدون تیور بدلے ہوئے کام نہیں چل سکتا تھا اصلاح کامل نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ

ناز پرور دہ تنعم نہ بردراہ بدوست عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

(نازوں سے پلے ہوئے اور نعمتوں کو پائے ہوئے دوست تک نہیں پہنچ سکتے۔ عاشقی بغیر مصیبت اٹھائے ہوئے حاصل نہیں ہوتی)

اور جو پیر کہ مرید کی مرضی کا لحاظ رکھے ہر امر میں موافقت کا اظہار کرے جو مرید کے لئے سم قاتل ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ پیر دنیادار اور رہزن ہے دکاندار ہے جو فقراء کا لباس پہن کر اور کچھ صوفیہ کے چٹکلے یاد کر کے لوگوں کو مکروفریب میں مبتلا کر کے اپنی دکان چلا رہا ہے۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

(ہر صوفی کا مال بے کھوٹ نہیں ہوتا۔ صوفیوں کے بہت سے کپڑے اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کو جلا دیا جائے) ایسے ہی لوگوں کے حق میں مولاناؒ فرماتے ہیں۔۔

حرف درویشاں بدزد دو مردوں! تا بہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(گھٹیا لوگ درویشوں کے الفاظ کی نقالی کرتے ہیں تاکہ جہلاء کو اپنا گرویدہ بنا سکیں) اور فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشمان دوختند از سخنہا عالمے را سوختند

(وہ قومیں بڑی ظالم ہیں جو اپنی آنکھیں سی لیتی ہیں اپنی گفتگو سے ساری دنیا کو جلا دیتی ہیں)

یادرکھو محض باتیں بنانے سے آدمی صوفی نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے باطن میں معرفت الٰہی ہوناشرط ہے۔

ہزار نکتہ باریک تر زمو اینجاست　　نہ ہر کہ سر بہ تراشد قلندری داند

(وہ یہاں بال سے بھی باریک ہزاروں نکتے ہیں ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جس نے سر منڈا رکھا ہو قلندری جانتا ہو) اور معرفت کے آثار میں سے ہے استغناء اور کسی کو دھوکہ نہ دینا اور اسرار کو نا اہل سے مخفی رکھنا

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی　　بگذار تا بمیرد و رنج و خود پرستی

(عشق و مستی کے راز مدعی کو نہ بتاؤ تا کہ وہ اپنی خود پرستی کے رنج میں خود ہی مرجائے) اور انکا تو یہ حال ہوتا ہے۔

عجب داری از سالکان طریق　　کہ باشند در بحر معنی غریق

دما دم شراب الم درکشند　　وگر تلخ بینند دم درکشند

(سالکان طریق نہ تا نہ تا غم کی شراب پی لیتے ہیں اگر کڑوی بھی ہو تو ایک ہی سانس میں پی لیتے ہیں)

غرض فقراء کی سی صورت بنانے سے فقراء کا سا لباس پہننے سے نہ آدمی فقیر ہی بنتا ہے اور نہ فقیری آتی ہے البتہ دکان خوب چلتی ہے عوام جہلاء خوب پھنستے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر محبوب حقیقی کی طلب صادق ہے تو شیخ کامل کی ان تدابیر کی جو موصل الی الحق ہیں برداشت کرنا چاہیے گو کیسی ہی نفس کو ناگوار ہوں۔ دیکھو مخلوق کی طلب میں کیسے کیسے مصائب اٹھائے جاتے ہیں سبکی برداشت کی جاتی ہے اور بخوشی گوارا کی جاتی ہیں۔ تو کیا محبوب حقیقی کی طلب میں اتنی مشقت بھی برداشت نہ ہو عجیب بات ہے۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود　　گوئے گشتن بہر او اولےٰ بود

(مولیٰ کا عاشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہو سکتا ہے اسکے عشق کیلئے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرنا بہتر ہے) خلاصہ یہ کہ جن حقائق کا اس وقت بیان ہو رہا ہے وہ ایسے حضرات کی صحبت و اطاعت سے منکشف ہوتے ہیں۔

روح قربانی

اب عود الی السابق کرتا ہوں کہ ہر عبادت کی ایک روح ہے اور روح قربانی کی فناء نفس ہے جو بذریعہ ذبح ولد واقع ہوئی تھی اور فناء نفس یہ ہے کہ خلاف خواہش کام کرنا اگر نفس کی آرزو چار نوافل کی ہو تو آٹھ پڑھے علی ہذا القیاس اگر صوم نفل سے اعراض کرے اور صلوٰۃ نفل پر خوش ہو تو صوم نفل کو اختیار کرے۔

ایک بزرگ کو جہاد فی سبیل اللہ کی خبر پہنچی تو نفس کی خواہش ہوئی کہ چلنا چاہیے مگر متردد ہوئے کہ کہیں اس ارادہ میں نفس کا شائبہ نہ ہو حق تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس تقاضا کی حقیقت بتلا دی جائے چنانچہ بعد میں معلوم ہوا کہ نفس کی خواہش جہاد کی طرف اس بناء پر ہے کہ ایک دفعہ ہی جو کچھ ہوتا ہے ہو رہے گا یہ روز کے

مجاہدوں اور چرکوں سے تو نجات مل جاوے گی پس فوراً جہاد کو ملتوی کر دیا اور اس شغل میں جو نفس کے خلاف نفس کشی کا تھا مشغول ہو گئے۔ ان کو اسی میں لطف آتا ہے کہ اس نفس پر روزانہ آرہ چلتا رہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانے دیگر است
افروختن و سوختن جامہ دریدن پروانہ ز من شمع ز من گل ز من آموخت

(تسلیم کے خنجر کے مارے ہوئے لوگوں کو ہر لمحہ اپنی جان اللہ کے راستہ میں دینی پڑتی ہے
پھڑکنا، جلنا، کپڑے پھاڑ دینا، پروانہ نے، شمع نے، پھول نے مجھ سے سیکھا ہے)

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

(عاشقی کیا ہے کہہ دو کہ محبوب کا غلام بن جانا دل دوسرے کے ہاتھ میں دے کر حیران رہ جانا)

غرض یہ حاصل ہے فنا نفس کا اور زہر کھا لینے کا نام فناء نفس نہیں ہے اور یہی فناء مذکورہ روح اضحیہ ہے۔ اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ تصوف کے مسئلے اس طرح ثابت ہوتے ہیں کہ سراپا مطابق قرآن و حدیث کے ہیں۔

قربانی میں کوتاہی

اب میں کچھ احکام متفرق قربانی کے بیان کر کے ختم کرتا ہوں کیونکہ مقصود احکام ہیں نہ کہ نکتے پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ قربانی کی روح فناء نفس ہے تو جس قربانی میں فناء نفس نہ ہو وہ قربانی بے روح ہے گویا قربانی ہی نہیں۔ اب بعض ان کوتاہیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو نفس کی متابعت میں اختیار کی جاتی ہیں۔ جو فناء نفس کے بالکل خلاف ہے یہ متعدد کوتاہیاں ہیں مثلاً بعض لوگ قربانی بخل کی وجہ سے نہیں کرتے اور بعض دوسری قوموں کی رعایت سے نہیں کرتے۔

اس کی زیادہ تر یہ وجہ ہے کہ ان لوگوں میں اسلامی قوت کامل نہیں اس لئے کہ قوت کاملہ کا یہ خاصہ ہے کہ کسی دوسری قوت کے اثر کو قبول نہ کریں۔ باوجودیکہ اسلامی قوت تمام قوتوں سے نہایت زبردست ہے پھر بھی جو بعض اہل اسلام بوجہ دیگر اقوام کے میل کے قربانی نہیں کرتے یا گائے کی قربانی پسند نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ ان کی اسلامی قوت کمزور ہو گئی اور آبائی اثر ان سے جاتا رہا جیسے بعض اولاد نالائق اپنے باپ کے اثر کو قبول نہیں کرتی ہے اور پھر کہتے ہیں کہ اس صورت میں گائے کی قربانی کی کیا ضرورت ہے جبکہ دوسرے جانوروں کی قربانی ہو سکتی ہی ہے اور کہتے ہیں کہ اس صورت میں گائے کی قربانی محض تعصب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ تعصب کسے کہتے ہیں پس سنو کہ تعصب کے معنی ہیں ناحق بات کی پچ کرنا اور ایک چیز تصلب ہے جس کے معنی ہیں حق بات پر پختہ اور مضبوط ہونا اب بتلاؤ کہ گائے کا ذبح کرنا شرعاً حق ہے یا ناحق۔ یقیناً حق ہے اور جو اس کو ناحق کہے اس کے اسلام میں کلام ہے جب یہ حق ہے تو اس پر پختہ اور مضبوط ہونا تعصب کیونکر ہوا بلکہ یہ تو تصلب فی الدین محمود و مطلوب ہے۔

پھر افسوس ہے کہ جن سے تم میل کرنا چاہتے ہو وہ تم سے میل کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم نے تو ہنود کی دوستی کی وجہ سے گائے کاٹنا چھوڑ دیا مگر ہنود نے تمہاری محبت میں گائے کاٹنا منظور نہ کیا تم نے تو ہنود کے اثر کو جو نہایت لچر اور بیہودہ اور ضعیف ہے قبول کیا اور ہنود نے تمہارے اثر کو جو نہایت قوی اور مستحسن ہے قبول نہ کیا۔ حقیقت میں اسلامی قوت وہ ہے کہ تمام قوموں پر غالب ہے وہ کسی کے اثر کو نہیں قبول کرسکتی بلکہ اپنا سکہ دوسری قوموں پر جماتی ہے اور یہاں بالعکس ہے تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں اسلامی قوت ہی نہیں اور گائے کاٹنا اور اس کا گوشت کھانا اگرچہ فی نفسہ فرض اسلامی نہیں لیکن اس وقت شعار اسلامی ضرور ہے۔ جو فی الحقیقت اسلام ہے اور شعار اسلامی کو کسی مخالف اسلام کے خوش کرنے کو چھوڑ دینا بڑے سے بڑا گناہ ہے اور اگر اس کے شعار ہونے سے بھی قطع نظر کیا جائے تب بھی ہمارے مذہب میں اس کا کاٹنا اور کھانا اس بناء پر ثواب تو ہے کہ اس میں ہنود کے عقیدہ شرکیہ کی مخالفت ہے تو آپ نے تو ہنود کی محبت کو اس قدر نباہا کہ ثواب کو چھوڑا، لیکن افسوس ہنود نے آپ کی محبت کی کچھ بھی پرواہ نہ کی کم از کم اتنا تو کرتے کہ اگر وہ گائے نہ کاٹتے تو مسلمانوں سے سود ہی لینا چھوڑ دیتے۔ مسلمانوں کو قرض بلا سود دے دیا کرتے۔ یہ عجیب اتفاق اور اتحاد ہے کہ آپ تو ہنود کی محبت میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور وہ آپ کو ہر بات میں ٹکا سا جواب دے جائیں۔

غرض مسلمان آج کل ہنود کا بکثرت اثر لیتے ہیں مگر یہ شان اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ یہ تو گائے کاٹنے کے متعلق تذکرہ تھا۔

بعض لوگوں نے کاٹنے سے تو تعرض نہیں کیا لیکن ہنود کے اثر سے گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیا اور یہ سب گائے کے نہ کاٹنے یا اس کے نہ کھانے میں گویا ہنود کے مشابہ بن گئے اور حدیث شریف میں آیا ہے **من تشبه بقوم فهو منهم** کہ جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان میں سے ہے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ کوئی بزرگ ہولی کے دنوں میں پان کھائے ہوئے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستہ میں ایک بیمار گدھا پڑا تھا انہوں نے اس پر پیک ڈال دی اور کہا تجھے ہولی میں کسی نے نہیں رنگا۔ لا تجھے میں رنگ دوں۔ بعد مرنے کے کسی نے خواب میں دیکھا کہ ہنود کی جماعت میں ہیں پوچھا اس کا کیا سبب ہے جواب دیا کہ میں نے ہولی میں گدھے پر پیک ڈال دی تھی عتاب ہوا کہ تو نے ہنود کی مشابہت رنگ ڈالنے میں کیوں کی تھی۔ لہٰذا ہنود کی جماعت میں رہو۔ پس ذبح گاؤ کا ترک تشبہ سے بھی خالی نہیں۔

قربانی سے بے رحمی کا شبہ

اور بعضے لوگ گائے کی قربانی اس وجہ سے نہیں کرتے کہ وہ دعوی رحم کا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قربانی بے رحمی ہے مگر تماشا ہے کہ وہ بکری وغیرہ کی قربانی کرتے ہیں اس صورت میں یہ دعوی عقل کے

بالکل خلاف ہے اس لئے کہ روح کا تعلق جیسے گائے سے ہے ویسے ہی بکری وغیرہ سے ہے جب بکری کی قربانی بے رحمی نہیں تو گائے کی قربانی بے رحمی کیوں ہے اور اگر گائے کی قربانی بے رحمی ہے تو بکری وغیرہ کی بھی بے رحمی ہے پھر ایک جگہ دعویٰ رحم اور ایک جگہ نہیں یہ تو انصاف کے خلاف ہے۔

علاوہ ازیں اگر چہ اس نے بکرے کی قربانی کی مگر پھر بھی یہ فعل روح اضحیہ کے خلاف ہے کیونکہ اس میں یہ شخص نفس کی موافقت کر رہا ہے جیسا اوپر مذکور ہوا جو فنائے نفس کے خلاف ہے اور ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ روح اضحیہ کی فنائے نفس ہے تو اس شخص کو روح اضحیہ جب حاصل ہوگی جب یہ گائے کی قربانی کرے جو اس کے نفس کے خلاف ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ بعض صوفیہ نے بھی تو گوشت کھانا چھوڑا ہے لہذا ہم بھی چھوڑتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ صوفیہ نے جو چھوڑا ہے وہ معالجہ نفس کی غرض سے چھوڑا ہے جیسا کہ بیمار کو بیماری کے زمانہ میں لذیذ غذاؤں سے روکا جاتا ہے اور گوشت ہی کیا صوفیہ نے تو تمام لذیذ کھانے چھوڑ دیئے ہیں تا کہ نفس کشی ہو۔ انہوں نے کسی قوم کے خوش کرنے کے لئے یا بوجہ رحم کے ترک نہیں کیا تھا۔ صاحبو! لوگوں نے تصوف کو سمجھا نہیں اور اسکو غلط استعمال کیا۔ چنانچہ گوشت کے ترک کو بھی تصوف سمجھ گئے جو سخت غلطی ہے اور تصوف کی غلطی کفر تک پہنچتی ہے کیونکہ تصوف اعلیٰ درجہ کی شئے ہے۔ جب اس میں غلطی واقع ہوتی ہے تو اسی پیمانہ پر جیسا کہ سوکھی روٹی اس درجہ نہیں سڑتی جس درجہ قورمہ سڑتا ہے غرض صوفیہ کی حالت پر اپنے کو قیاس کرنا محض لغو ہے۔

نیز جو لوگ گائے ذبح نہ کرنے میں دعویٰ رحم کا کرتے ہیں وہ بدفہم بھی پورے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قربانی کا بھی حکم دیا ہے اور جانوروں پر رحم کرنے کا بھی حکم فرمایا ہے اگر قربانی خلاف رحم ہوتی تو اللہ تعالیٰ جو سب سے زیادہ رحیم ہیں وہ کیوں اس کا حکم فرماتے مگر جب اللہ تعالیٰ نے قربانی کا حکم فرمایا ہے اب اس کو بے رحمی کہنا گویا معاذ اللہ خدا کو بے رحم کہنا ہے۔

رہا یہ کہ خدا نے کہاں حکم کیا ہے تو اس کے لئے ہم قرآن سے ثبوت دے سکتے ہیں۔ اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا عقلی دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں جس کا جی چاہے گفتگو کرلے تو اس صورت میں اس کو بے رحمی کہنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا تو رحیم نہیں اور حضرت انسان ایسے رحیم ہیں کہ اس نے قربانی کو بالکل خلاف رحم سمجھا تو گویا حضرت انسان صفت رحیمی میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ٹھہرے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

اللہ تعالیٰ کے برابر جانوروں پر تو کیا دشمنوں پر بھی کوئی رحم نہیں کر سکتا۔ ان کی رحیمی کو دیکھئے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دسترخوان پر ایک کافر آ گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اول تو یہ سمجھ کر مسلمان ہے بٹھلا لیا اور جب بسم اللہ نہ کہنے پر اور اس کی وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دشمن خدا ہے فوراً دسترخوان سے اٹھا دیا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوا کہ اے ابراہیم اس کو نوے برس کفر کرتے کرتے ہو گئے ہم نے ایک وقت بھی اس پر کھانا بند نہیں کیا اور تمہارے دسترخواں

پر عمر بھر میں ایک دفعہ آ گیا تم نے اس کو دھکے دیدیئے۔

وگرا دے برد پیش آتش سجود　　تو واپس چرا میکشی دست جود

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کافر کو دوبارہ بلایا کہ آ ؤ میرے ساتھ کھانا کھالو چاہے بسم اللہ نہ پڑھنا۔اس نے کہا پہلے آپ نے مجھے کھانے سے منع کر دیا۔اب بلاتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے یہ سن کر وہ شخص مسلمان ہو گیا اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھایا)۔

خورش دہ بہ کنجشک و کبک و حمام　　کہ شاید ہمائے درافتد بدام

(ہما کو شکار کرنے کے لئے چڑیا، چکور اور کبوتر کو بھی دانہ ڈالنا پڑتا ہے)

چو برگوشہ تیر نیاز افگنی　　بنا گاہ بینی کہ صیدے کنی

(شیر کے سروں پر حاجتوں کو ڈالا جائے گا کہ جب اچانک اس پر نظر پڑے گی تو اس کو شکار کرے گا)

ایک بار حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ چالیس برس تک مٹی کے برتن بناؤ چنانچہ حسب الحکم چالیس برس تک انہوں نے مٹی کے برتن بنائے پھر حکم ہوا کہ سب کو توڑ ڈالو۔انہوں نے حسب الحکم سب توڑ ڈالے لیکن قلق ہوا کہ افسوس میں نے ان برتنوں کو بنا کر ایک بار دیکھا بھی نہیں۔

حیف درچشم زدن صحبت یار آخر شد　　روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

(افسوس کہ میں ابھی محبوب کو پل بھر بھی نہ دیکھ پایا تھا کہ ملاقات ختم ہوگئی پھول کو آنکھ بھر بھی نہیں دیکھ پائے کہ ملاقات ختم ہوگئی)

حکم ہوا اے نوح دیکھو اپنی بنائی ہوئی چیز کا تم کو کس قدر قلق ہوا اب سوچو کہ ہم نے تمہارے کہنے سے اپنی بنائی ہوئی مخلوق کو ایک دم غرق کر دیا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے جب جانور بنائے اور ان کے حقوق ثابت کیئے اور ان پر رحم کرنے کی بھی تاکید فرمائی اور پھر بھی قربانی کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ قربانی خلاف رحم نہیں۔

مسلمان میں صفت رحم

اور غالب خاصیت عادۂ رحم کی یہی ہے کہ اگر کوئی عارض قوی نہ ہو تو تکلیف سے بچاتے ہیں تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ بظن غالب جانوروں کے ذبح ہوتے ہوئے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنا غم کیا جاتا ہے یعنی طبعی موت سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ کم ہوتی ہے یہ تو حکم طبعی ہے اور ذوق سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اتنی کم ہوتی ہو کہ مثل نہ ہونے کے ہو کیونکہ عاشق کے لئے بڑی خوش نصیبی ہے کہ محبوب کے سامنے گردن جھکے اور اس کے نام پر قربان ہو جائے اور خدا تعالیٰ سے محبت ہر چیز کو ہے۔

اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ محبوبان خدا سے ہر شئے کو محبت ہوتی ہے ان مقدمات پر نظر کر کے تو یہ کہا جاوے گا کہ ذبح کے وقت قربانی کے جانور کا یہ حال ہوگا۔

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے　　　کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

جس وقت جانور کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح ہوتا ہوں تو خوشی میں مست ہوجاتا ہے یہی نکتہ ہے اس میں کہ بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا جائے کہ اس سے جانور مست ہوجاتا ہے۔ اور کچھ تکلیف نہیں ہوتی چنانچہ اس کی ایک نظیر بھی ہے کہ شہداء کو خدا کے نام پر سر دینے کی خاص خوشی ہوتی ہے اور ان کو کچھ تکلیف نہیں ہوتی البتہ جانور اپنی مستی کو بوجہ بے زبان ہونے کے ظاہر نہیں کرسکتا مگر شہداء کی مستی تو ظاہر بھی ہوجاتی ہے لوگوں کے سامنے سینہ سپر ہونا اور بے تحاشا معرکہ میں گھس جانا ہر شخص کو نظر آتا ہے۔ یہ تو شہادت کے مبادی ہیں جن میں مجاہد کی لذت ظاہر ہوتی ہے۔

باقی خود شہادت کے متعلق خود حدیث شریف میں آیا ہے کہ شہداء کو قتل ہونے پر ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے کہ ایک چیونٹی نے کاٹا ہو اور خوشی اور مستی کیوں نہ ہو وہ تو بزبان حال یوں کہتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کے مقدر میں یہ بات نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہوں دوستوں کا سر سلامت رہے تو اپنے خنجر اس پر آزمالے)

پس اسی طرح جانوروں کو بھی ذبح سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ چونکہ ان کی آرزو ہے کہ ہم اللہ کے نام پر قربان ہوں اس وجہ سے ان کی قربانی کر کے ان کو راحت پہنچائی جاتی ہے۔ پس جاہل ہے وہ شخص جو بے رحمی کے خیال کی وجہ سے قربانی چھوڑتا ہے۔

اسی طرح قربانی کو دیکھ کر بعض مخالف قوموں کا یہ کہنا کہ مسلمان بے رحم ہیں یہ ان کی سخت غلطی ہے اس لئے کہ رحم ایک کیفیت وجدانی ہے۔ ہر ایک شخص کو اپنی کیفیت معلوم ہے دوسرے کی کیفیت ہرگز نہیں معلوم ہوسکتی باوجود عادت ذبح کے مسلمانوں کے صفت رحم کی یہ بین دلیل ہے کہ مسلمان باوجودیکہ قربانی کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کے دل میں اس قدر رحم ہے وہ کسی جانور کی تکلیف کو دیکھ نہیں سکتے۔ بلکہ واللہ مسلمان تو عین ذبح کرتے ہوئے بھی جانور پر رحم کرتے ہیں اور ذبح کی حالت دیکھ کر ان کا دل پگھل جاتا ہے۔

قربانی اور مجاہدہ

چنانچہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ نے ایک دفعہ ایک گائے کی قربانی کی تھی جس کی قیمت اسی روپیہ تک قصائی دیتے تھے مگر مولاناؒ نے نہیں دی اور قربانی کردی لیکن حالت یہ سنی گئی تھی کہ مولانا روتے جاتے تھے اور قربانی کرتے جاتے تھے۔ دیکھئے یہ کتنا بڑا مسلمانوں کا مجاہدہ ہے کہ دل پانی پانی ہوتا

ہےاور قربانی کرتے ہیں۔ واللہ یہی نفس کی قربانی ہے کہ نفس کے خلاف کام ہو۔

میں نے ایک صوفی سے جس نے سماع کے متعلق مجھ سے سوال کیا تھا کہ بتلاؤ مجاہدہ کیا ہے کہا کہ نفس کے خلاف کرنا میں نے کہا کہ سچ بتلاؤ تمہارا دل گانا سننے کو چاہتا ہے کہا ہاں۔ میں نے کہا کہ پھر گانا سننا تو مجاہدہ کے بالکل خلاف ہوا پھر گانا کیوں سنتے ہو وہ اس کا جواب کچھ نہ دے سکا محض ساکت رہا۔

حضرت سلطان جی کی حکایت ہے کہ آپ کے زمانہ میں ایک جوگی تھا جس کسی بیمار پر نظر ڈالتا وہ اچھا ہو جاتا تھا۔ اتفاق سے حضرت بیمار ہوئے متعلقین نے عرض کیا کہ حضرت فلاں جوگی سلب مرض کرتا ہے اگر حکم ہو تو اس کو بلالیں آپ نے ناراضی ظاہر فرما کر انکار کر دیا۔ اتفاق سے حضرت ایک روز زیادہ بیہوش ہو گئے تو متعلقین بوجہ غایت محبت و تمنائے صحت کے حضرت کو حالت بیہوشی میں اس جوگی کے گھر لے گئے۔ اس نے نظر ڈال کر سلب مرض کرنا شروع کیا یہاں تک کہ حضرت کو ہوش آ گیا اور اچھے ہو گئے۔

گو وہاں لایا جانا حضرت کو نا گوار تو ہوا مگر اس پر بھی یہ چاہا کہ جوگی کے احسان کی مکافات کریں اور اس کو بھی کسی مرض سے اچھا کر دیں تو آپ نے اس جوگی سے دریافت فرمایا کہ تو نے یہ عمل کس طرح حاصل کیا ہے جوگی نے عرض کیا کہ میرے گرو نے کہا تھا کہ ہر کام نفس کے خلاف کیا کر۔ بس یہ اس کا اثر ہے تو آپ نے توجہ ڈال کر اس سے دریافت فرمایا کہ بتلا تیرا دل اسلام لانے کو چاہتا ہے کہا نہیں۔ حضرت نے فرمایا پھر اس میں نفس کے خلاف کیوں نہیں کرتا۔ یہ تو تیرے مجاہدہ میں کسر رہی جاتی ہے اس پر وہ لا جواب ہو گیا اور فوراً مسلمان ہو گیا۔

ایسا ہی جواب میں نے اس صوفی کو دیا تھا کہ تم خاک مجاہدہ کرتے ہو کہ نفس نے سماع کا تقاضا کیا اور سن لیا دیکھو مجاہدہ ہم کرتے ہیں کہ بعض دفعہ چشتیت کے اثر سے سماع کا تقاضا اندر سے ہوتا ہے مگر دل کو مار کر رہ جاتے ہیں اور نہیں سنتے۔ سو حضرت یہ مسلمان ہی کا دل ہے کہ نفس کی خواہشوں پر خاک ڈالتا ہے اور باوجود یکہ رحم سے پانی پانی ہوتا ہے پھر قربانی کرتا ہے۔ واللہ یہ اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ ہے۔

گائے کے ذبح کا قرآنی ثبوت

بعض لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا ذبح اور اس کا کھانا قرآن سے ثابت نہیں۔ اس کی وجہ قرآن سے ناواقفیت ہے۔ قرآن میں گائے کا ذبح کرنا اور اس کا کھانا دونوں موجود ہیں دیکھئے قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً .... وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ط الیٰ اخر الایۃ

ترجمہ: اور مواشی میں اونچے قد کے اور چھوٹے قد کے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے کھاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ آٹھ نر و مادہ میں بھیڑیں دو قسم اور بکری دو قسم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو یا اس کو جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے ہیں تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر تم سچے ہو اونٹ میں دو قسم اور گائے میں دو قسم۔

اس آیت سے گائے کا ذبح اور اس کا کھانا بالتصریح ثابت ہو رہا ہے۔

نیز یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہر شئے میں درجہ اعتدال مطلوب ہوتا ہے حد اعتدال میں جب تک شئے رہتی ہے ٹھیک اور درست رہتی ہے۔ اور جہاں حد اعتدال سے نکلی معاً خراب اور مضر ہو جاتی ہے علیٰ ہذا القیاس رحم بھی اگر حد اعتدال میں رہے تو ٹھیک و درست ہوگا ورنہ مضر ہوگا دیکھو اگر ہر جگہ رحم کیا جائے جیسا ہنود دعویٰ کرتے ہیں تو اعتدال نہ رہے گا افراط ہوگا جیسے بعض لوگ سانپ بچھو کو بھی نہیں مار سکتے اور اس کا نتیجہ خراب یہ ہوگا کہ اشرف مخلوق یعنی انسان پر تو ظلم ہوگا اور دوسری اشیاء پر جو ارذل مخلوق ہیں۔ یعنی سانپ بچھو وغیرہ ان پر رحم ہوگا جو بالکل عقل و نقل کے خلاف ہے۔ پس بحمد اللہ ذبح جانور کے متعلق جو شبہات تھے وہ سب رفع ہو گئے اگر چہ یہ تقریر مناظرانہ نہیں مگر ہم کو خود مناظرہ کا ڈھنگ ہی پسند نہیں نہ ہم کو غیروں کے اعتراضوں پر نظر نہ ان کے مذہب پر جس کی مناظرہ میں ضرورت ہے۔

البتہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں کوئی عیب نہیں ہے اگر کوئی ہمیں یہ کہے کہ تم کانے ہو تو یہ ضرور نہیں کہ ہم جواب میں یہ ثابت کریں کہ تم اندھے ہو بلکہ محض یہ کہنا کافی ہوگا کہ اگر ہم کانے ہیں تو تم ہماری اچھی آنکھ کو بند کر لو دیکھو پھر بھی ہم کو دوسری آنکھ سے جس کو تم کانی بتاتے ہو نظر آتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح جو لوگ مناظرہ کرنے والے ہیں جن کی دوسرے مذاہب کی اندرونی حالت پر بھی کافی نظر ہے وہ تو یوں بحث کرتے ہیں کہ مخالف نے ان کو کانا کہا اور انہوں نے اس کو اندھا ہونا ثابت کر دیا۔ اور ہم یہ کرتے ہیں کہ اپنا بے عیب ہونا ثابت کر دیتے ہیں ہم کو مناظرہ کا زیادہ شوق نہیں بس ہم کو تو پرانا ڈھنگ آتا ہے اور یہی کافی ہے۔

علاوہ ازیں سب سے آخری بات یہ ہے کہ ہم کو تو خدا و رسول کے حکم کا اتباع کرنا ہے اور کسی کے جرح و قدح سے کیا مطلب۔ باقی میں نے جو مخالفین کے شبہات کا کچھ جواب دیدیا ہے یہ محض تبرع ہے کیونکہ بعض ناواقف مسلمان ان سے متاثر ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی قوت اسلامی کے ضعیف ہونے کی دلیل ہے ورنہ اگر جاہل مسلمان بھی پکا مسلمان ہو تو قیامت تک کسی فلسفی کے باپ سے بھی متاثر نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوتی ہے اس کے پاس تمام اعتراضوں کا ایک جواب یہ ہوتا ہے کہ احمق یہی تو حضور نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ اپنے جانور ذبح کرو بخدا اگر حضور ہمیں یہ حکم دیتے کہ اپنی اولاد اور بیویوں کو ذبح کرو تو ہمیں اس سے بھی حرج نہ ہوتا۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا .... وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا

ترجمہ:۔ ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کر دیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو تو بجز ملا دے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی بجا نہ لاتا اور اگر یہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا یا وہ ان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا۔

جانور کی جگہ قیمت دینا

اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے وہ یہ کہ ایک شخص تھے کہ ایام قربانی میں جانور ذبح نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی قیمت خیرات کر دیا کرتے تھے کسی رات کو وہ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ میدان قیامت برپا ہے اور پل صراط قائم ہے اور دوسرے کنارے پر جنت ہے، بہت لوگ اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہو کر پل صراط کو طے کرتے ہیں اور جنت میں داخل ہو جاتے ہیں اور یہ شخص حیران اور پریشان کھڑا ہے کہ میں کس طرح گزروں نہ میرے پاس سواری ہے نہ اور کوئی حیلہ ہے اور یہ شخص یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ سواریاں لوگوں کے پاس کہاں سے آتی ہیں اور کون دیتا ہے اچانک آواز آئی کہ یہ سواریاں ان لوگوں کی ہیں جنہوں نے دنیا میں اپنے لئے تیار کی تھیں یعنی یہ سواریاں قربانی کے جانور ہیں چونکہ تم قربانی نہیں کرتے ہو لہٰذا تم سواری سے محروم ہو۔ جب آنکھ کھلی، بہت متاثر ہوئے اور قربانی نہ کرنے سے توبہ کی اور قربانی کرنے لگے۔ صاحبو! قربانی کا یہ نتیجہ ظاہر ہے حدیث میں اس کی صراحت ہے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ گھٹیا جانور کی قربانی کرتے ہیں حالانکہ قربانی بجائے اولاد کے ہے جیسا کہ بناء قربانی کا واقعہ اس پر شاہد ہے اس لئے چاہیے کہ عمدہ سے عمدہ جانور کی قربانی کی جاوے۔ غرض یہ ہے کہ اچھا جانور ذبح کرنا چاہیے۔

قربانی میں وسعت کا لحاظ

بعض ایسا کرتے ہیں کہ باوجود وسعت کے ایک ہی جانور کی قربانی کرتے ہیں اگر کسی کو وسعت کافی ہو تو اس کو چاہیے گو واجب نہیں مگر آخر حقوق بھی کوئی چیز ہیں اس بناء پر مناسب ہے کہ اپنے بزرگوں کی طرف سے بھی قربانی کرے اور ایک قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کرے آپ کو امت کے ساتھ کیسی محبت تھی کہ آپ اپنی طرف سے تو قربانی کرتے ہی تھے ایک قربانی زیادہ کرتے تھے اور فرماتے کہ یہ ان لوگوں کی طرف سے ہے کہ جو میری امت میں سے قربانی کی وسعت نہیں رکھتے اور ایک روایت میں ہے کہ عن محمد وامتہ اور ایک روایت میں ہے ھذا عمن آمن بی و صدقنی (ہکذا فی جمع الفوائد) (یہ اس کی طرف سے جو مجھ پر ایمان لایا اور میری تعریف کی) دیکھئے کیسی محبت تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ حالانکہ ہم اس وقت موجود بھی نہ تھے مگر آپ کو ساری امت سے غائبانہ محبت تھی۔

ما نبودیم و تقاضا ہم نبود لطف تو ناگفتہ ما می شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا تیرے لطف نے ہمیں بغیر مانگے ہی نواز دیا)

ادائے حق محبت عنایت ست ز دوست ورنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خور سندست

(محبت کا حق ادا کرنا دوست کی عنایت ہے ورنہ مسکین عاشق کے پاس تو کچھ نہیں بھی تو پھر بھی راضی ہے)

قربانی کی کھال

ایک ضروری مسئلہ یہ ہے کہ قربانی میں اتباع رسم جائز نہیں مثلاً پائے کسی کے اور سری کسی کی کھال کسی کی یہ بالکل خلاف شرع ہے۔ ہم تو ایسا کرتے ہیں کہ نائی سقہ وغیرہ کو اس کی محنت کی مزدوری الگ دے دیتے ہیں اور اس کے ساتھ کبھی بطور ہدیہ کے سر بھی دے دیتے ہیں اور کہہ بھی دیتے ہیں کہ تمہارا حق نہیں۔ علی ہذا القیاس بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ قربانی کی کھال مسجد کے ملا کو دے دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا حق خدمت ہے یہ بھی جائز نہیں اس میں بھی وہی صورت کرنا چاہیے کہ ان کا حق الخدمت علیحدہ ہونا چاہیے اور کھال کے اندر آپ مختار ہیں کبھی ان کو دیجئے اور کہہ دیجئے کہ یہ آپ کا حق نہیں اور کبھی نہ دیجئے۔ اور جب ملا کو مسجد میں رکھیں تو اسی وقت صاف کہہ دیں کہ تم کو کھال نہ ملے گی باوجود اس کہنے کے پھر اگر دے دی تو جائز ہے۔ غرض کبھی دیدو اور کبھی نہ دو۔ التزام ہی سے ذہنوں میں یہ حق ہو گیا ہے کہ جیسے آج کل مریدین پیر کی نذر کو اپنے ذمہ لازم سمجھتے ہیں یہ بھی خلاف قاعدہ بلکہ مضر ہے کیونکہ پیر کو اس کی عادت ہو جاتی ہے اور یہ عادت موجب اشراف نفس ہے۔ جو پیر کے لئے مضر ہے یہ کیا انصاف ہے کہ وہ تمہارا دین سنواریں اور تم ان کو بگاڑو اس سے پیروں کو بہت نقصان پہنچتا ہے پیر کے دل میں دنیا طلبی آ جاتی ہے اور وہ رنگ ہو جاتا ہے جیسا ایک قصہ ہے کہ ایک مرید نے اپنا خواب پیر سے بیان کیا کہ حضرت میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری انگلیاں پاخانہ میں بھری ہیں اور آپ کی انگلیاں شہد میں بھری ہوئی ہیں۔ پیر جی خوش ہو کر بولے کیوں نہ ہو تو دنیادار ہے اور ہم پرہیز گار ہیں۔ مرید نے عرض کیا کہ حضرت اس سے آگے کچھ اور بھی دیکھا ہے پیر صاحب نے کہا وہ کیا۔ مرید نے عرض کیا کہ حضرت وہ یہ ہے کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی۔ تب تو پیر صاحب بہت شرمندہ ہوئے تو اس کی واقعی تعبیر یہ تھی کہ پیر تو مرید سے دنیا حاصل کر رہا تھا اور مرید پیر سے دین حاصل کر رہا تھا۔

اور پیروں میں یہ دنیا طلبی کا مضمون زیادہ تر مریدوں کے التزام ہدیہ سے آتا ہے۔ اس کو ترک کر دینا چاہیے۔ اسی طرح مسجد کے ملا کو التزاماً کھال نہ دو ورنہ وہ اس کو اپنا حق سمجھ کر پھر تمہاری کھال کھینچے گا۔

گوشت کی تقسیم

باقی رہا گوشت کا حکم تو اس میں اختیار ہے آپ جس کو چاہیں دیں خواہ غنی کو خواہ فقیر کو سب جائز

ہے مگر قصائی کو گوشت کاٹنے کی اجرت میں ہرگز نہ دیا جائے کہ یہ اجرت میں داخل ہو کر ثواب اضحیہ کو باطل کر دے گا۔ اور گوشت بانٹنے میں اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے خرچ کے موافق نکال کر باقی فقراء اور عزیز و اقارب کو تقسیم کر دیا جائے اور ان لوگوں کا لحاظ خصوصیت کے ساتھ رکھنا چاہیے جو بوجہ عدم وسعت کے قربانی نہیں کر سکے اور یہ جو آج کل ادلا بدلا ہوتی ہے یہ تو بالکل ہی خلاف عقل ہے جب ان اہل مبادلہ میں ہر شخص کے یہاں قربانی ہوتی ہے تو پھر ایک دوسرے کے یہاں خواہ مخواہ یہ بھیجنا ہے۔

*** الا ان يكون لحم احدهما اطيب و از كى فلا باس بارساله الى صديقه الذى قدضحى ۱۲ جامع)**

ترجمہ:۔ ہاں اگر یہ ہو کہ کسی ایک کی قربانی کا گوشت اچھا ہو اور عمدہ ہو تو پھر اپنے ایسے احباب کے یہاں قربانی کا گوشت بھیج دینے میں کوئی حرج نہیں جس کے گھر میں قربانی ہوتی ہو۔

فقط واخر دعوانا ان الحمدلله رب العٰلمين والصلوٰة والسلام علىٰ خير خلقه سيدنا و مولانا محمد وعلىٰ آله واصحابه اجمعين.

اشرف علی (ج ا۔ ۱۳۵۵ھ)